سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۱۹۲

چند ہم عصر

نوشتہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم

انجمن ترقی اردو پاکستان

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان نمبر ۱۹۲

چند ہم عصر

نوشتہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہم

شائع کردہ

انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان۔ اُردو روڈ، کراچی

قیمت : [illegible]

طبع چہارم (بعد نظرِ ثانی و اضافہ)

طبع چہارم (بعد نظر ثانی و اضافہ) ——————— سنہ ۱۹۵۳ء

مطبوعہ
انجمن پریس
لارنس روڈ، کراچی

فہرست مضامین

سلسلہ شمار	مضمون	صفحہ
۱	منشی امیر احمد مینائی	۱
۲	پروفیسر مرزا حیرت	۱۰
۳	سیّد محمود	۱۹
۴	مولوی چراغ علی	۲۹
۵	مولوی محمد عزیز مرزا	۶۴
۶	شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی	۷۱
۷	خواجہ غلام الثقلین	۱۰۴
۸	حکیم امتیاز الدین	۱۱۱
۹	مولانا وحید الدین سلیم	۱۱۳
۱۰	گدڑی کا لال۔ نور خاں	۱۱۷
۱۱	محسن الملک	۱۲۸
۱۲	مولانا محمد علی	۱۳۸
۱۳	شیخ غلام قادر گرامی	۱۴۲
۱۴	حالی	۱۴۴
۱۵	سر سید راس مسعود	۱۶۴
۱۶	میرن صاحب	۱۸۱

صفحہ	مضمون	سلسلہ شمار
۱۹۵	نام دیو ۔ مالی	۱۷
۲۰۱	سر سید احمد خاں	۱۸
۲۹۲	ڈاکٹر محمد اقبال	۱۹
۲۹۷	مولانا حسرت موہانی	۲۰
۳۰۱	عبدالرحمٰن صدیقی	۲۱
۳۰۴	درویش پروفیسر ۔ دی ہٹ سک	۲۲
۳۶۰	عبدالرحمٰن بجنوری	۲۳

دیباچہ

گزشتہ نصف صدی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ نے اپنے ہم عصر بزرگوں اور ہم نشینوں پر مختلف اوقات میں جو مضامین تحریر فرمائے تھے ان سب کو مولوی صاحب کے ایک لائق اور ہونہار شاگرد شیخ چاند مرحوم نے جمع کیا تھا چند ہم عصر انھیں مضامین کا مجموعہ ہی۔ یہ مجموعۂ مضامین اس قدر مقبول ہوا کہ اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں اِسے رکھا گیا، اور اس وقت تک بعض جامعات کے نصاب میں داخل ہی۔

چند ہم عصر کے اب تک تین اڈیشن شائع ہو چکے تھے، اور اب یہ چوتھا اڈیشن پیش کیا جا رہا ہی تیسرا اڈیشن کافی نظرثانی اور اضافے کے ساتھ چھپا تھا، اور سرسید مرحوم پر مولوی صاحب قبلہ کا قابلِ قدر مضمون پہلے پہل اسی اڈیشن میں شامل کیا گیا۔ یہ مضمون دوسرے مضامین کے مقابلے میں طویل ہی۔ اور سرسید مرحوم کے متعلق بہت ساری نئی باتیں اس سے معلوم ہوتی ہیں۔ سرسید کی سیرت اور اُن کے کردار پر اتنی وضاحت کے ساتھ اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا تھا۔ یہ مضمون لکھ کر حق تو یہ ہی کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنا حق ادا کر دیا ہی۔

موجودہ اڈیشن میں عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا حسرت موہانی، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ری ہٹ سک اور ڈاکٹر بجنوری پر نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہی۔ اس لحاظ سے کتاب کی قدر و قیمت پہلے کی نسبت بڑھ گئی ہی۔

آخر کے دو مضامین اس وقت دستیاب ہوئے جبکہ تمام مضامین کی کتابت ہو چکی تھی یہی وجہ ہی کہ خلافِ ترتیب انھیں آخر میں رکھنا پڑا۔ آیندہ

اڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی جائے گی۔

مولوی صاحب نے اپنے ہم عصروں پر جو کچھ لکھا ہے، وہ موصوف کے مشاہدات اور ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لیے ہر مضمون میں دلچسپی اور اثر انگیزی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے اور کوئی مضمون ایسا نہیں جسے کوئی شروع کرے اور ختم کیے بغیر چھوڑ دے ان مضامین میں جہاں مولوی صاحب کی اعلا انشا پردازی اور بلند مذاقی کے جوہر نمایاں ہیں، وہاں ہر واقعہ اتنا اہم اور کارآمد ہے کہ اگر وہ ضبط تحریر میں نہ آتا تو ہمارا بہت بڑا قومی نقصان تھا۔ بعض بزرگوں کی عجیب عجیب باتیں ہمیں چند ہم عصر کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

چند ہم عصر نے اُردو میں کردار نگاری کی جو قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے اور اُردو ادب پر اس کتاب کا جو اثر پڑا ہے، اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مولوی صاحب نے جس ڈھب سے اُردو نثر کو سنوارا اور نکھارا ہے وہ دنیائے اُردو میں بے حد مقبول ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس کتاب کا پایہ بہت بلند ہے۔

اس مجموعے میں ملک کے نامی گرامی لوگوں کے علاوہ چند ایسے لوگوں پر بھی مضامین موجود ہیں جو بالکل معمولی آدمی تھے، لیکن ان میں جو خدا داد صلاحتیں اور غیر معمولی خوبیاں تھیں اُن تک صرف مولوی عبدالحق صاحب ہی کی نظر جا سکتی تھی، اور موصوف نے اُن پر مضامین لکھکر ان غیر معروف لوگوں کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ تکلف سے عاری سادے اور ہلکے پھلکے لفظوں میں بعض ایسی ایسی باتیں مولوی صاحب لکھ گئے ہیں کہ انھیں پڑھ کر منکر سے منکر کو بھی اُردو زبان پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اور ہر بات پورے خلوص سے لکھی گئی ہے، اور ہر واقعہ پوری دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چند ہم عصر اُردو کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ تحسین سروری

منشی امیر احمد مینائی مرحوم

سنہ ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد صاحب مینائی ہندوستان کے سربرآوردہ اور نہایت ممتاز شعرا میں خیال کیے جاتے ہیں۔ چونکہ اُنھوں نے حال ہی میں حیدرآباد میں اِنتقال فرمایا ہے لہذا اُن کے حالات جہاں تک ہمیں دستیاب ہو سکے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

آپ کے والد کا نام مولوی کریم محمد تھا۔ حضرت مخدوم شاہ مینا جن کا مزار شریف لکھنؤ میں ہے آپ کے سلسلۂ اجداد میں سے تھے۔ خود شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ تجرّد میں زندگی بسر کی اِس لیے اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے بھائی کے اولاد ہوئی۔ چنانچہ منشی صاحب مرحوم کو بھی ان ہی کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ ۱۶ شعبان سنہ ۱۲۴۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی معمولی کتابیں علمائے وقت کی خدمت میں پڑھیں۔ علاوہ اس کے طِب، جفر، نجوم وغیرہ میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔ مگر ذوق شعرگوئی غالب تھا۔ تدبیر الدولہ مظفر الملک منشی سید مظفر علی خان بہادر اسیر امیٹھوی امین صدر امانت نصیر الدّین حیدر شاہ و میر منشی امجد علی شاہ و واجد علی شاہ سے تلمذ اختیار کیا۔ اور اس رنگ کی شاعری کو اپنے اُستاد سے زیادہ فروغ دیا۔ بالشبہ منشی صاحب مرحوم فخر اسیر تھے۔

منشی صاحب سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ کے دربار میں بھی باریاب ہوئے۔ اس باریابی کی وجہ غالباً ان کی دو کتابیں ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان ہوئیں۔ یہ کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں اور نہ یہ پتہ ملتا ہے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ غالباً یہ بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ واجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اُٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لیے اِسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دئے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز اُن کے درباری ان کتابوں کو اعلا تصانیف میں سے خیال کرتے تھے۔ ایسی اَن مل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قائم کرنا منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔ وہ تا انتزاع سلطنت وہیں رہے۔

غدر کے بعد ماہ رمضان ۱۲۷۵ھ میں بعہد فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں بہادر تخلص ناظم ریاست رام پور میں تشریف لائے۔ نواب نے بڑی قدردانی اور اعزاز کیا۔ سُنا ہے کہ اِبتداءً نواب ایک صاحب بیمار تخلص کو اپنا کلام دکھاتے تھے، بعد ازاں مرزا نوشہ غالب سے اصلاح لینی شروع کی اور ایک مدت تک ان ہی کو اپنا کلام دکھایا۔ اسی زمانے میں منشی صاحب سے مشورہ فرماتے رہے۔ چنانچہ نواب صاحب کی واسوختوں اور نیز بعض دیگر نظموں سے منشی صاحب کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ شروع شروع میں ایک عرصے تک منشی صاحب رام پور میں محکمہ عدالت دیوانی

کے مفتی رہے اور یہی وجہ ہو کہ مفتی جی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر کے زمانے میں نظارت مطبع خاص پانگاہ سرکاری، میر اخباری، مصاحبی وغیرہ کے مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ نواب نے منشی صاحب ہی کو اپنی اُستادی کے لیے اِنتخاب فرمایا اور ان کی مزید شہرت کا ایک بڑا سبب نواب صاحب کا تلمذ بھی تھا۔

منشی صاحب کی شاعری

منشی صاحب اسیر کے شاگرد تھے اور اسیر کو مصحفی سے تلمذ تھا۔ آتش، ناسخ، اسیر، خواجہ وزیر اور منشی صاحب ایک طبقے یعنی قریب قریب ایک رنگ کے شاعر ہیں، مصحفی کے رُتبے کو نہیں پہنچتے۔ مصحفی مشکل پسند بھی تھے اکثر سنگلاخ زمینوں میں کہتے اور کھینچ تان کے حق اُستادی ادا کرتے۔ اسی سے اکثر شعر اُن کے بےمزہ رہے مگر ان کا صاف اور شگفتہ کلام بھی بہت کچھ ہو۔ ناسخ بلاشبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کے ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ اُن کے کلام میں نہ نمکینی ہو نہ شیرینی نہ زبان کا لطف ہو نہ مضمون کا۔ خواجہ وزیر ان سے بھی دو ہاتھ بڑھے ہوئے ہیں۔ اس طبقے کے اوّلین میں سے آتش اور آخرین میں سے امیر بہت غنیمت ہیں یعنی باوجود اس قسم کی شاعری کے صفائی سے کام لیا ہو اور اس لیے بعض اشعار بہت صاف اور عمدہ نکل گئے ہیں۔ منشی صاحب کا اخیر کا کلام اور بھی زیادہ صاف ہوگیا ہو اور بھونڈے استعارات کے لچھے بہت کم نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں اُن کے چند اشعار نقل کرتے مگر چونکہ ان کا کلام بے انتہا مشہور ہوچکا ہو اور ان کے دیوان قریباً ہر ایک شوقین کے پاس موجود ہیں اِس لیے

ضرورت نہ سمجھی گئی۔ منشی صاحب مرحوم اُردو شاعری کے تمام اصناف پر قادر تھے۔ قصائد بلند اور پُرزور ہیں۔ ترجیع بند، ترکیب بند، واسوخت وغیرہ سب اپنی اپنی طرز پر اچھے لکھے ہیں مگر رُباعیات پھیکی ہیں۔ نعت میں منشی صاحب کے کئی رسالے ہیں مثلاً محامدِ خاتم النبیین، ذکر شاہ انبیا، صبحِ ازل، شام ابدان کی مشہور نعتیہ نظمیں ہیں۔ محامدِ خاتم النبیین خصوصاً بہت مقبول ہوئی اور بار بار چھپی۔ نعت کا جو طرز ہمارے اکثر شعرا نے اختیار کیا ہے وہ بہت قابلِ اصلاح ہے۔ ہمارے ہاں شاعری کی بنا غزل پر رکھی گئی ہے جو ایک لحاظ سے کمترین قسم شعر کی ہے اس لیے تغزّل کا رنگ کچھ ایسا جما ہے کہ ہر جگہ جا و بیجا اُسی کی جھلک نظر آتی ہے۔ بھلا نعت میں زلف و کمر خال وخط وغیرہ سے کیا تعلق۔ مانا کہ یہ بھی سہی مگر یہ کیسی غضب کی بات ہے کہ جو مقصد نعت کا ہے اور جو نعت کی جان ہے وہ بالکل غائب۔ گو بعض اوقات منشی صاحب بھی اُسی ڈھرّے پر چلے ہیں مگر اُنھوں نے بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔ غالباً مولانا حالی کا رنگ آئندہ شاعری پر بہت کچھ اثر ڈالے گا اور ہماری شاعری کے بہت سے عیوب کو پاک کردے گا۔ حق یہ ہے کہ جسے نعت دیکھنی ہو وہ مولانا حالی کی نعت دیکھے۔ نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو خدا کے نبی کے لیے شایاں ہے اور جس کے پڑھنے اور سُننے سے لوگوں پر رُوحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ کمال بشریت اسے کہتے ہیں نہ یہ کہ تمام نعتیہ قصائد سُننے کے بعد دل پر یہ اثر ہو کہ کسی شاہدِ رعنا، خوش رو، خوش اندام، نازک بدن حسین کی تعریف ہے۔ بہرحال منشی صاحب کا نعتیہ کلام بہت غنیمت ہے گو وہ اُس اعلا رُتبہ کا نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیے مگر اس قسم کے نعتیہ کلاموں میں بہت قابل تعریف ہے۔ منشی صاحب کی شاعری پر بحیثیت مجموعی اگر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ

ان تمام فنون سے جو کلام موزوں کرنے اور شعر کہنے کے لیے ضروری ہیں پورے ماہر ہیں بلکہ اُستاد کامل ہیں۔ ان کی نظر بہت وسیع ہو مگر بلند نہیں، میرا مطلب اس سے یہ ہو کہ جو دائرہ ہمارے شعرا نے اپنی شاعری اور طبیعت کی جولانی کا قرار دیا ہو اُسی تنگ دائرے میں آپ کو وسعتِ نظر حاصل ہو مگر اس سے بڑھ کر قدم نہیں رکھا ہو۔ اور منشی صاحب ہی پر کیا منحصر ہو ہمارے اکثر شعرا کا یہی حال ہو۔ زبان کی تحقیق ضرور ہو مگر بے ساختہ پن اور صفائی کم ہو۔ اس قسم کی شاعری کے لیے شوخی بھی ایک ضروری چیز خیال کی گئی ہو مگر وہ داغ پر ختم ہو۔ منشی صاحب کے کلام میں نہیں۔ اور جہاں کہیں کوشش کی ہو شعر پھس پھسا ہو کے رہ گیا۔ اہل لکھنؤ کے مذاق کے مطابق اُنھوں نے مضامین باندھنے میں بلند پروازی بھی کی ہو مگر اس میں کچھ اُن ہی لوگوں کو مزہ آتا ہوگا۔ شاید اس سے زورِ اُستادی دکھانا مقصود ہوتا ہو نہ زورِ شاعری مگر وہ اپنے خیالات کے اظہار پر پورے قادر ہیں۔ الفاظ کی بندش اور ترکیب ایسی ہوتی ہو کہ کسی کو حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ غرض منشی صاحب کا کلام اپنے رنگ میں اچھا ہو اور پڑھنے کے قابل ہو۔

امیر اللغات

اب صرف امیر اللغات کا ذکر کرنا باقی رہ گیا ہو۔ اِس کتاب کو منشی صاحب کا بہت بڑا کام بلکہ سرمایۂ عمر کہنا چاہیے۔ اُردو زبان میں ایک بسیط اور جامع لغت کی بہت ضرورت ہو اب تک کوئی ایسی کتاب کامل موجود نہیں ہو۔ سوائے دو ایک انگریزوں کی لغات کے جو بہت غنیمت ہیں اور خصوصاً مسٹر فیلن کی ڈکشنری جو قابلِ تعریف ہو۔ ایک اور لغت بنام فرہنگِ آصفیہ

مؤلفہ مولوی سید احمد صاحب دہلوی ہے جو فی الحقیقت اچھی کتاب ہے مگر اب تک ناتمام ہے۔ منشی صاحب کی کتاب کی صرف دو جلدیں چھپی ہیں اور اُن دونوں میں صرف (الف) کا بیان ہے۔ تیسری جلد جس میں (ب) ہے تیار ہے مگر چھپی نہیں۔ اِس کتاب کی تکمیل کے لیے ایک زمانہ اور صرفِ کثیر درکار تھا۔ افسوس کہ منشی صاحب کا انتقال ہوگیا اور یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ دیکھیے ان کے فرزندوں اور دوستوں میں سے کوئی اس کا بیڑا اُٹھاتا ہے یا نہیں۔

اس کتاب کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۸۸۴ء میں جب سر الفرڈ لائل سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی شمالی رام پور تشریف لائے تو اُنھوں نے نواب کلب علی خاں بہادر سے فرمایا کہ اُردو زبان کی ایک جامع لغت اگر آپ کی وساطت سے تیار ہو جائے تو بہت بڑا کام ہوگا۔ نواب صاحب نے منشی صاحب سے فرمایا۔ منشی صاحب کو اس کا پہلے ہی سے خیال تھا۔ حسب ارشاد ۱۸۸۶ء میں لفظ "آنکھ" کے متعلق تمام محاورات وغیرہ لکھ کر نمونتاً لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمت میں روانہ کیے۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے ان اوراق کو پسند فرمایا اور یہ وعدہ کیا کہ اس میں پوری مدد دی جائے گی اور اس کے لیے بڑا چندہ جمع کیا جائے گا کہ جس سے علاوہ اخراجات طبع مؤلف کی بھی محنت کا پورا صلہ مل جائے اور یہ بھی تجویز کی کہ ہمیشہ پہلے چند ورق کے پُروف چھپوا کر ملک کے مختلف صوبوں میں بھیجے جایا کریں تاکہ سب لوگوں کو اس پر نکتہ چینی اور بحث کرنے کا موقع ملے۔ اور بعد کامل چھان بین کے طبع ہوا کرے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں سر الفرڈ لائل چلے گئے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کا انتقال ہوگیا اور ان تمام اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کے بعد جنرل عظیم الدین خاں بہادر نے منشی صاحب کو پوری مدد دی اور اس کے اخراجات

کے لیے تقریباً چار سو روپے ماہانہ کی منظوری فرمائی جو اُن کے زمانے تک برابر ملتے رہے مگر افسوس کہ تھوڑی مدّت کے بعد وہ جواں مرد بھی ظالموں کے ہاتھ سے شہید ہوا اور یہ مدد بھی اس کے ساتھ ہی موقوف ہوگئی۔ اس زمانے میں نواب حامد علی خاں بہادر نے کسی قدر رقم اس کتاب کے لیے منظور فرمائی تھی کہ ہزار افسوس خود منشی صاحب رحلت فرما گئے۔

لغت لکھنے کے لیے یہ ضرور ہے کہ آدمی علاوہ فارسی، عربی کے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا سے بھی بخوبی واقف ہو کیوں کہ اُردو زبان مین اکثر اسما و افعال اور تراکیب زیادہ تر سنسکرت کی ہیں اور جب تک اس زبان سے پوری واقفیت نہ ہوگی اس کی تحقیق کبھی مستند نہیں ہو سکتی۔ علاوہ اس کے کسی ایک یورپین زبان مثلاً فرنچ، انگریزی یا جرمنی سے بھی واقف ہونا ضرور ہے تاکہ لغت کے اعلا نمونے بھی اس کے پیش نظر رہیں اور علم اللسان اور تنقید اللسان کا پورا مطالعہ کر سکے۔ حق یہ ہے کہ اب تک جتنی اُردو لغات لکھی گئی ہیں اُن میں زبان کی تحقیق کا پورا حق ادا نہیں ہوا مگر جو کچھ ہو رہا ہے بہت غنیمت ہے اور ایک روز اسی مواد سے اعلا درجہ کی لغات تیار ہو جائیں گی۔ منشی صاحب نے اپنی لغت میں ذرا طوالت سے کام لیا ہے مثلاً آپ سے بہت بہت اُمید ہے یا آپ بیڈھب آدمی ہیں یا آپ جانیں آپ کا کام وغیرہ ایسے فقرے ہیں جو الفاظ کا استعمال دکھانے کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن بطور لغت کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ان فقروں میں آپ کی کوئی تخصیص نہیں۔ یا بعض الفاظ کی تعریف ناقص ہے مثلاً آلو بخارا کے یہ معنی لکھنا کہ "ایک قسم کا آلو جو بخارا میں پیدا ہوتا ہے" صحیح نہیں، وہ ہندوستان میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ الفاظ کی تحقیق اور اصل سے بہت کم بحث کی گئی ہے یا بعض الفاظ کے بہت

باریک اور لطیف فرق جو قابلِ بیان تھے رہ گئے ہیں۔ یہ امر شاید باعثِ حیرت ہوگا کہ جتنی عمدہ لغات اُردو کی اِس وقت موجود ہیں یا تو وہ خود انگریزوں کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کی تحریک سے لکھی گئی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انگریزی کا اثر اُردو (ادب) پر بہت اچھا پڑ رہا ہے اور اگر یہی حال رہا تو ایک روز اُردو زبان بہت وسیع ہو جائے گی۔ اس وقت جو کام ہو رہا ہے وہ بالکل ابتدائی ہے اور جو اُردو زبان کے لیے اس وقت کام کر رہے ہیں وہ گویا اس بنیاد کو پختہ کر رہے ہیں جس کی پوری قدر آئندہ چل کر معلوم ہوگی۔ غالباً اسی کتاب کے خیال سے منشی صاحب حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اعلاحضرت حضور نظام کی فیاضیاں چار دانگ عالم میں مشہور ہیں کچھ عجب نہ تھا کہ منشی صاحب اس میں کامیاب ہو جاتے مگر حیدر آباد آتے ہی بیمار ہو گئے اور بیماری نے اس قدر طول کھینچا کہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ شنبہ کے روز رحلت فرما گئے۔

قطع نظر ادعائے شاعری منشی صاحب مرحوم نہایت با اخلاق اور پاک سیرت آدمی تھے۔ تکبر و عجب نام کو نہ تھا، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے۔ وقار اور متانت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور علاوہ اس کے بہت شگفتہ بیان تھے۔ منشی صاحب مرحوم کی وفات کی بہت سی تاریخیں ہوئیں۔ ہمارے لائق دوست مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے بھی اُن کی متعدد تاریخیں لکھی ہیں جن میں بعض ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کی تاریخیں ہمیشہ بے تکلف اور واقعات کے عین مناسب ہوتی ہیں۔ ایک تاریخ تو غریب الوطنی ہے جس کا لطف خصوصاً اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ منشی صاحب کا یہ شعر بھی پیش نظر ہو۔

اب نہ ٹھہروں گا کرے میری خوشامد بھی وطن — کہ بلایا ہی غریب الوطنی نے مجھ کو

۱۳۱۸

ایک اور تاریخ ہوئی ہی۔

وہ اُستاد نواب خلد آشیاں — ہوا راہیٔ آخرت ناگزیر

کہا مجھ سے رضواں نے سال وصال — کہ خلد آشیاں ہی جناب امیر

۱۳ ھ ۱۸

دیگر

جس دم کیا امیر نے دُنیا سے انتقال — جو منشی وسخن ور و مفتی تھا اور فقیہ

اُس وقت مجھ سے ہاتف غیبی نے یوں کہا — کہہ خاتمہ امیر کا تاریخ فی البدیہہ

۱۳ ھ ۱۸

دیگر

لوگ کہتے ہیں امیر آئے تھے — اُن کو بھائی تھی دکن کی مٹی

ہاں یہ آتے ہی حضوری پائی — کیا رسائی تھی دکن کی مٹی

ہوئی اس وصل کی فصلی تاریخ — مرنے لائی تھی دکن کی مٹی

۱۳۱۰ھ

پروفیسر مرزا حیرت

سنہ ۱۹۰۰ء

ملٹن اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے کہ شہرت شریف النفس انسان کا آخری ضعف ہے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ جنھیں خدا نے غیر معمولی دماغی قوت عطا کی ہے اور جن کا علم و فضل تبحّر کے رُتبے کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ وہ شہرت پر لات مار کر کنج تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے فلسفے اور خیالات میں خواہ وہ بادِ ہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو اس "ضعف" کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو ایک غلام یا بیل اور گھوڑے کی طرح ناگوار محبّت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی "ہاہا" اور چند سمجھ داروں کی "واہ واہ" کے لیے کاغذ کو سیاہ اور اپنے لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے مرزا حیرت پرُوفیسر الفنسٹن کالج بمبئی تھے جن کے مختصر حالات ہم اس وقت لکھنا چاہتے ہیں۔

وہ صحیح النسب سید تھے مگر تعجب ہے کہ وہ ہمیشہ اسے چھپاتے رہے۔ وہ سنہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوے یعنی جس سال کہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئیں ان کا خاندان ایران میں بہت شریف اور نامور تھا۔ شاہانِ صفویہ کے

زمانے میں سیاسی (پولیٹکل) انقلابات کچھ ایسے واقع ہوئے کہ اس خاندان کے دو حصے ہوگئے۔ ایک تو اصفہان میں جا کر آباد ہوگیا اور دوسرا طہران میں جا بسا۔ اس خاندان میں کئی شخص علم و فضل اور تدبیرِ سلطنت میں بہت نامور گزرے ہیں۔ چنانچہ پرُوفیسر حیرت کے پردادا مرزا جعفر، کریم خاں بانیٔ خاندان شاہان زند کے وزیرِ اعظم تھے۔ اور ان کے ایک اور بزرگ عبدالباقی شاعر اور طبیب گزرے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور و معروف شاعر معتمد الدولہ المتخلص بہ نشاط، ماں کی طرف سے ان کے عزیز ہوتے ہیں۔ وہ فتح علی شاہ کے زمانے میں وزیر اُمورِ خارجہ تھے۔

ابھی ان کی عمر چار سال ہی کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ان کی غور و پرداخت اور پرورش ماں ہی نے کی۔ افسوس ہے کہ ان کی ماں ایک بد مزاج مغلوب الغضب اور کم سمجھ عورت تھی اور اگرچہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات بچپن ہی سے ان میں غیر معمولی فراست اور ذہانت کے آثار نظر آتے تھے لیکن وہ زمانہ خوشی سے نہ گزرا۔ چھ سال کی عمر میں اُنھیں شاہ کجلاہ کی حضوری میں پیش کیا گیا۔ شاہ اِس بچے کی حیرت انگیز ذہانت اور خوش خطی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور خوش ہو کر ایک قلمدان اور اشرفیوں کی تھیلی عنایت فرمائی۔ اب یہ بچے سے بڑے ہوئے تو شرافت خاندانی اور خداداد قابلیت کی وجہ سے لوگ اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں صوبۂ گیلان کی صوبہ داری (گورنری) نذر کی گئی۔ مرزا حیرت نے اُسے قبول نہ کیا۔ کیوں کہ ایران میں یہ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی اعلا عہدے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے تو اسے شاہی خزانے میں ایک معتد بہ رقم داخل کرنی پڑتی ہے اور جب وہ اپنی جگہ پر فایز ہو جاتا ہے تو خوب ہاتھ رنگتا ہے

اور جتنا دیتا ہے اُس سے بیس گنا زیادہ وصول کرلیتا ہے۔ مرزا حیرت کا یہ استغنا اس عمر میں نہایت قابل تعریف تھا۔ انھوں نے اس جبر و تعدی اور اس سلسلۂ ظلم و ستم کو ناپسند کیا اور یہ روا نہ رکھا کہ غریب رعایا کا خون چوس کر اپنے تن و توش کی پرورش کی جائے۔ مگر اس سچائی اور ایمانداری کی کچھ قدر نہ ہوئی بلکہ برخلاف اس کے تمام عزیز و اقربا خصوصاً ماں ہاتھ دھو کر مرزا کے پیچھے پڑ گئی دربار شاہی میں بھی وہ وقعت نہ رہی۔ غرض زندگی تلخ ہوگئی۔ اور انھیں مجبوراً وطن مالوف کو خدا حافظ کہہ کر وادیٔ غربت میں قدم رکھنا پڑا۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال کی تھی لیکن اس زمانے کے وزرا و اعیان سلطنت، شعرا، مصنفین، علما و فضلا سے نہایت بے تکلفانہ اور برابر سرابر کا برتاؤ تھا۔ قاآنی جو اس زمانے کا نہایت نامور شاعر ہوا ہے اس سے مرزا حیرت کی بڑی گہری دوستی تھی اور دوسرا مشہور و معروف شاعر یغما اکثر ان کے گھر مہمان رہتا تھا۔ ایران چھوڑ کر انھوں نے ایشیا کوچک اور قسطنطنیہ کی سیاحت کی۔ کچھ عرصے قسطنطنیہ میں قیام کیا اور فرنچ زبان سیکھی جسے وہ پہلے ایران میں شروع کر چکے تھے۔ علاوہ اس کے وہاں رہ کر یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ اب عرب کے مقدس مقام سنا میں مقیم ہو کر عزلت و امن کی گود میں درویشانہ اور صوفیانہ زندگی بسر کریں۔ جب وہ عدن پہنچے تو جنگ کریمیا زوروں پر تھی۔ یہ ایک کشتی کے انتظار میں تھے۔ دفع الوقتی کے خیال سے انھوں نے وہاں کی فصیلوں اور قلعہ کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ ایک ایک شے کو ایسی گہری نظر سے دیکھ رہے تھے کہ سنتریوں کو شبہ ہوا اور روسی جاسوس سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ عربی، فارسی، ترکی فرانسیسی زبانوں کے ماہر جو کچھ انھوں نے کہا کسی نے یقین نہ کیا۔

اور جب یہ بیان کیا کہ میرا ارادہ گوشہ نشینی اختیار کرنے اور درویشانہ زندگی بسر کرنے کا ہے تو اُن کا شبہ اور بھی بڑھ گیا۔ انھیں مجبوراً اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور زندگی کے اس نظر فریب پہلو سے بال بال بچ گئے اور بحالت نظر بندی انگریزی رجمنٹ کی معیت میں پہنچائے گئے۔ یہ واقعہ مرزا حیرت کی زندگی میں بڑا انقلاب انگیز ہے۔ نیرنگئ تقدیر سے میاں حیرت درویش ہوتے ہوتے ایک روز پروفیسر حیرت ہوگئے۔ وہی نامعلوم اسباب جو انھیں ایک مقدس مقام میں رہبا نیت اور عزلت گزینی کے لیے لے چلے تھے کشاں کشاں ایک انگریزی کالج میں لے آئے جس سے نہ صرف الفنسٹن کالج بلکہ تمام بمبئی پریسیڈنسی کو فخر اور عزت حاصل ہوئی۔ یہاں پہنچ کر وہ دو سال تک برابر بحالت نظر بندی رہے۔ رجمنٹ کے افسر لوگ ان سے فارسی پڑھنے لگے گویا وہ "منشی" کا کام دیتے تھے مگر اس عرصے میں وہ بھی اس مجبوری کی فرصت کو خوب کام میں لائے یعنی انگریزی شروع کر دی اور اِس خوبی سے حاصل کی کہ لوگوں کو ان کی انگریزی زبان کی قدرت پر حیرت ہوتی تھی۔ جب اس بندھن سے خلاصی پائی تو اُنھوں نے انگریزی ملازمت اختیار کی اور خلیج فارس کے محکمۂ تار میں نوکر ہو گئے۔ چوں کہ اس علاقے کی زبان سے واقف تھے اِس لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کے محکمۂ فارسی کے مترجم مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں اُنھوں نے گورنمنٹ کی درخواست پر سر جان ملکم کی تاریخ ایران کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ یہ کام اُنھوں نے اِس لیے شروع کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے اپنا قرض ادا کریں۔

اگرچہ اس کا طرز تحریر و خیال انگریزی ہے مگر بحیثیت ایک فارسی کتاب کے بڑے سے بڑا نقاد بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔ گو یہ کتاب بہ لحاظ فصاحت

ناسخ التواریخ کو نہیں پہنچی مگر اس میں شک نہیں کہ ناسخ التواریخ کے بعد اس زمانے میں کوئی کتاب فارسی زبان میں اس پائے کی نہیں لکھی گئی۔ اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ تالیف و ترجمہ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ تالیف و تصنیف میں بہت آزادی ہوتی ہے اور انشا پردازی اور فصاحت کے جوہر دکھانے کا موقع حاصل ہوتا ہے اور ترجمہ میں مجبوراً مصنف کے قدم بہ قدم چلنا پڑتا ہے۔ اس زمانے میں ایران میں جہاں ایک دو مصنف ایسے پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ خالص پارسی زبان لکھی جائے جس میں عربی کا مطلق لگاؤ نہ ہو وہاں کثرت سے ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو عربی الفاظ اور عربی ترکیبوں کو کثرت سے استعمال کرنے لگے ہیں حتیٰ کہ ایسے الفاظ اختراع کر لیے ہیں جو عربی زبان میں بھی استعمال نہیں ہوتے یا عربی الفاظ ایسے معنوں میں استعمال کرنے لگے ہیں جو اصل زبان میں نہیں۔ ان دو کتابوں میں بھی عربیت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ تاریخ ملکم میں چونکہ مترجم کو مصنف کے خیالات کا اظہار اور انگریزی طرز تحریر کا نبھاؤ منظور تھا اس لیے عربی الفاظ کا کثرت سے استعمال کرنا ناگزیر تھا۔ اس کتاب کے لیے مترجم کو اپنے ہم وطنوں سے بہت کچھ لعن طعن اور برا بھلا سننا پڑا۔ زیادہ تر اس لیے کہ انھوں نے مصنف کے خیالات حتیٰ کہ اس کے نقائص کو بھی صحیح صحیح درج کر دیا ہے۔ ایران میں بحیثیت انشا پردازی کے تو اس کتاب کی بہت تعریف ہوئی مگر پہلے پہل اس سے سخت مخالفت اور نفرت کی گئی مگر اب وہ تعصب بہت کم ہو گیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب صرف ایک ترجمہ ہے لیکن دنیا میں اس نامور فاضل کی ایک یادگار رہے گی جو اس سے بہتر اور اعلیٰ یادگار قائم کر سکتا تھا مگر طبیعت کا حجاب یا خود اس کا کمال مانع ہوا اور کوئی یادگار اس نے

اپنی پیچھے نہ چھوڑی۔

مئی ۱۸۷۲ء میں الفنسٹن کالج کے پروفیسر فارسی مقرر ہوئے اور (۲۶) سال تک اپنا فرض نہایت حسن وخوبی کے ساتھ ادا کیا۔ اس کے پاکیزہ صفات ان کے شریفانہ اطوار اس کی بلند حوصلگی اور وسعت خیالات کا اثر ان سب پر موجود ہے جو اُن سے واقف تھے یا جنھوں نے اس کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ کالج کے وہ طلبہ جو اس زمانۂ دراز میں رہے آئے اور گئے ان کی آنکھوں میں اس نامور شخص کی صورت ان کے دلوں میں اُس کی قابلیت اور عجیب خیالات وحرکات اور ان کے خیالات میں اس کی جوہر شرافت وجواں مردی کا اثر باقی ہے۔ تمام طلبہ اور اساتذہ ان کی بہت عزت کرتے اور ان سے محبت رکھتے تھے۔ اپنی اعلا قابلیتوں اور نہایت وسیع مطالعہ اور عربی وفارسی اور دیگر زبانوں میں وسعت نظر کی وجہ سے پروفیسری کے عہدے کے لیے نہایت موزوں تھے۔ کالج کو ایسے شخص کی پروفیسری سے بڑا اعزاز اور فخر تھا مگر افسوس کہ اب ہندوستان کے کسی کالج کو ایسا پروفیسر ملنا مشکل ہے۔ ان کا علم اس قدر وسیع اور اُن کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ اگر حافظ اور سعدی کی تصانیف دُنیا سے مٹ جاتیں تو وہ صرف اپنے حافظے کے زور سے بلا کم وکاست پھر پیدا کر سکتے تھے۔ ان کو اساتذہ کے ہزارہا عربی اور فارسی اشعار یاد تھے اور موقع پر بلا تامل سینکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی انشاپردازی میں وہ عدیم النظیر تھے۔ کالج میں پڑھاتے وقت وہ کبھی کتاب ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے اور اس خوبی سے تمام مطالب اُن کی تشریح اور تنقید کرتے تھے کہ طلبہ کو حیرت

ہوتی تھی۔ ہندوستان میں وہ عربی اور فارسی کے اُستاد یگانہ سمجھے جاتے تھے
اور ایران میں بھی ان کا شمار مشہور انشا پردازوں میں تھا۔ مگر افسوس کہ ان
کی طبیعت میں کچھ ایسا حجاب تھا کہ کبھی میدان شہرت میں قدم نہ رکھا اور نہ کوئی
ایسا کام کیا جس سے عام طور پر لوگ ان کی اعلا قابلیت کا صحیح اندازہ کر سکتے
اور یہی وجہ ہے کہ پبلک میں ان کا سکہ نہ بیٹھا اور بہت لوگ بمبئی سے باہر ان
سے ناواقف رہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ان سے واقف تھے بہت کم لوگ
یہ جانتے تھے کہ وہ ایک اعلا درجے کے شاعر تھے۔ طبیعت میں بلا کی آمد تھی کہ اگر ان
کے تمام اشعار جمع کیے جاتے تو ایک ضخیم کتاب بن جاتی۔ مگر مرنے سے چند سال
پہلے انھوں نے اپنی تمام نظموں کو تلف کر دیا۔ صرف چند نظمیں باقی رہ گئیں جو
اس وقت ان کے ہاتھ نہ لگیں۔ ان کا دماغ، ان کا حافظہ، ان کی قوتِ مشاہدہ،
ان کی فیاضی سب غیر معمولی تھی۔ اُن کی نظروں میں روپے کی کچھ حقیقت نہ تھی
سوا اس حالت کے جب کہ وہ کسی بیکس مظلوم کی امداد میں خرچ کرتے۔ انھیں
اپنے فرضِ منصبی کا بہت بڑا خیال تھا اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی صحت
تک کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ وہ ہر ایک چیز سے درگذر کر سکتے تھے مگر جھوٹ،
ریا اور دیانت کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ایک فلسفیانہ مزاج کے شخص تھے۔
وہ اپنے قوم و ملک کے تمام علوم و فنون سے واقف تھے۔ اِسلامی ممالک
کی سیاسی اور علمی تاریخ میں ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ اور قدیم سے قدیم علمی اور
تاریخی حالات ان کی نظر میں ایسے ہی تھے جیسے موجودہ زمانے کے واقعات۔
انھوں نے فلسفہ، منطق، نجوم، طب کو بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ
عربی اور ایرانی کھانے بھی خوب پکانا جانتے تھے مگر انھیں خاص دلچسپی
دینیات سے تھی۔ اور آخر دم تک وہ دُنیا کے تمام مذاہب کے علم اور

مذہبی صداقت کی جستجو میں سرگرم رہے۔ اگر وہ اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا کے کہنے پر چلتے تو آج سلطنت ایران میں شاہ کے بعد سب سے بڑے شخص یا مشہور شاعر یا مصنّف ہوتے اور اگر انھیں اپنے ارادے میں کامیابی ہو جاتی تو وہ آج کسی گمنام اسلامی خانقاہ میں دفن ہوتے۔ نیرنگیٔ تقدیر دیکھیے کہ نہ یہ ہوا اور نہ وہ ہوا اور وہ زندگی جو نہ معلوم کیسے کیسے عجیب و غریب حادثوں، شورشوں اور انقلابات میں کٹتی، انگریزی کے پُرامن عہد میں بمبئی کے الفنسٹن کالج میں بسر ہو گئی اور ایک ایسے مفید شغل میں بسر ہوئی جو تمام انقلابات سے بری ہے۔

پروفیسر حیرت اس زمانے میں ضعیف ہو گئے تھے اور یہ خیال تھا کہ مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد جب پنشن لے کر فارغ البالی سے بسر کریں گے تو ان کی صحت درست ہو جائے گی۔ لیکن یہ امر ناشدنی تھا، وہ ماہ اگست ۱۸۹۹ء میں اتفاقاً اپنے باغ میں (بہ مقابل پریل جو مضافات بمبئی سے ہے) گر پڑے اور اُس وقت سے رفتہ رفتہ ان کی قوت نے جواب دے دیا اور آخر اکتوبر کو اس دُنیا سے رحلت فرما گئے۔

ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے دو پُرانے شاگردوں نے پورا پورا حق خدمت ادا کیا۔ وہ ہر وقت ان کے پاس حاضر رہتے اور کامل طور پر ان کی نگہداشت اور غور و پرداخت کی۔ وہ پاک طینت عالی دماغ فاضل جس گمنامی کو ہمیشہ پسند کرتا تھا اُسی گمنامی میں یہاں سے چل بسا۔ افسوس دُنیا نے اُس کی پوری قدر نہ کی۔ اور نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ دُنیا اس کی قدر کرے۔ مگر وہ چند لوگ جو اس کی اعلا خوبیوں کے سچے قدر دان تھے اُس پر دل سے آبدیدہ ہوئے اور حسرت و افسوس کے ساتھ اُسے مادرِ زمین کے آغوش میں لٹا دیا۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　کیا ہی ملکِ روم ہے اور سرزمینِ روس ہے
سب طرح سے راحت و حشمت میں کیجے زندگی　　اس طرف آوازِ طبل اُودھر صدائے کوس ہے
سُنتے ہی عبرت پکاری اک تماشا میں تجھے　　چل دکھاؤں تو جو حرص و آز کا محبوس ہے
لے گئی اک بار کنِ گورِ غریباں کی طرف　　جس جگہ جانِ تمنّا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے　　یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھو تو ان سے کہ مال و حشمتِ دُنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

مرحوم اپنی تمام کتابیں الفنسٹن کالج لائبریری کو وصیت کر مرے ہیں جو کالج میں زمانۂ دراز تک مرحوم کی یادگار رہیں گی۔

سید محمود مرحوم کی وفات پر تقریر

جو حیدر آباد کے جلسۂ تعزیت میں کی گئی

حضرات! آپ سن چکے ہوں گے کہ چند روز ہوئے ہم میں سے ایک بہت بڑا شخص اٹھ گیا ہے جس کے انتقال پر آج ہم اظہار غم کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں۔ لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو، خصوصاً جب کہ اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیم النظیر ہو اور خاص کر جب یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے ہی سے قحط الرجال ہے تو ایسی موت غضب ہے اور قیامت ہے۔

بہت کم لوگ لکھے پڑھے ایسے ہوں گے جو مرحوم کے نام سے واقف نہ ہوں باوجودیکہ نہ ان کی ایسی زیادہ تصانیف ہیں جو ملک میں رائج ہوں اور نہ ایسے کچھ مضامین اور آرٹیکل لکھنے والوں میں سے تھے جنھیں اخباری دنیا میں شہرت ہوتی ہے تاہم ان کا نام بہت سے ایسے لوگوں سے زیادہ مشہور ہے جن کی تصانیف پونڈے کی پوٹ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے انھیں ایسا جوہر

عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ جوہر اس کی غیر معمولی دماغی قوت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار باندھنے سے۔ اور نہ ان کی تعلیمی حالت کوئی خاص طور پر ممتاز تھی۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہندوستان میں صرف میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اس کے بعد سرکاری وظیفے سے ولایت گئے جہاں انھوں نے کوئی اعلا امتحان نہیں دیا۔ سوائے ڈگری حاصل کرنے کے اور ایسے ڈگری یافتہ خیر سے ہمارے ملک میں سینکڑوں ہیں۔ اس شخص کی زندگی سچی مثال اس امر کی ہے کہ لیاقت کی معیار امتحانات اور ڈگریاں نہیں ہوسکتیں۔ البتہ قیام ولایت میں انھیں ایک امر میں ضرور تفوق ہے اور وہ یہ کہ وہاں انھیں اعلا صحبت نصیب ہوئی۔ چنانچہ اس صدی کا سب سے بڑا انگریز شاعر لارڈ ٹنی سن اور اس صدی کا بہت بڑا انگریز فلاسفر مل اور ایک بہت بڑا عالم پروفیسر ان کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔

ولایت سے آنے کے بعد انھوں نے کچھ دن بیرسٹری کی جس میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔ اور ان کی تعلیم میں جو قرض ہوگیا تھا اسے ادا کیا۔ نواب مختار الملک بہادر مرحوم جو بلا کے مردم شناس اور قدردان تھے انھیں حیدرآباد کھینچ لائے۔ غالباً وہ یہاں سال بھر تک رہے۔ یہاں سے جانے کے بعد لارڈ ڈلٹن نے انھیں سشن جج مقرر کردیا۔ سر سید نے اسے پسند نہ کیا اور کہا کہ میرا مقصد محمود کو تعلیم دلانے سے یہ ہرگز نہ تھا کہ ملازمت کے پھندے میں پھنس جائے بلکہ ہمیشہ میرا منشا اُن کی تعلیم سے یہ رہا کہ وہ مجھے میرے کام میں مدد دے۔ لیکن لارڈ ڈلٹن کے اصرار سے وہ چپ ہو رہے۔ تھوڑے عرصے بعد وہ ہائی کورٹ کے جج ہوگئے۔ یہاں آکر ان کے اصل جوہر کھلے اور ان کی غیر معمولی اور وسیع لیاقت کو امتحان کا کافی میدان ملا

تمام بڑے بڑے قانون دانوں نے اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ محمود کا دماغ قانون کے لیے خاص طور پر بنایا گیا تھا۔ ان کے فیصلوں سے ان کی حذاقت، تحقیق اور وسعتِ نظر اور ذوقِ سلیم کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرینِ فن اور اساتذہ ان کے فیصلوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تیرہ خاک میں بھی ایسے ایسے قابل جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے یہ فیصلے دُنیا میں ان کی بڑی یادگار رہیں گے۔ اگرچہ وہ اس سے اعلا اور بہتر یادگار چھوڑ سکتے تھے لیکن خود ان کا حجاب یا کمال اس کا مانع ہوا اور کوئی یادگار نہ چھوڑ سکے۔ لیکن یہ بات صرف قانونی مسائل تک نہ تھی بلکہ جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وغیرہ وہ ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ ایک بڑے عالم نے مجھ سے بیان کیا کہ اگرچہ وہ عربی نہیں جانتے تھے لیکن جب بھی کسی فقہی مسئلے کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو وہ کتاب پڑھوا کر سنتے اور مطلب پوچھتے لیکن بعض اوقات اِدھر اُدھر کے بعض الفاظ سمجھ جانے سے کہتے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے اور خود بیان کرتے۔ یہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی زبان سے ان مسائل کو سن کر حیرت ہوتی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ تیرہ سو سال کے عرصے میں اگر کوئی شخص شارع کا صحیح مطلب سمجھا ہے تو وہ محمود ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص کس بلا کا دماغ لے کر آیا تھا۔ ان کی دماغی قوت کا صرف وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کو ان سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا موقع ہوا ہے۔ ان کی باتیں نہایت پُر لطف اور مزے کی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص اور ہر فرقے میں مقبول تھے۔

ان کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ انسائیکلو پیڈیا تھے اور اس لیے ان کی باتیں اور گپ شپ نہایت دل چسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھی۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث ان کے سامنے پیش کیجیے وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سمجھا دیتے تھے۔ وہ بڑے ظریف بھی تھے۔ ان کی ظرافت بھی عجیب شان کی ظرافت تھی۔ ان کے ایک ایک ٹھٹھول میں وہ وہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ ان کے خاص خاص لفظ اور جملے جن میں جدت اور طباعی کی بو پائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چبھتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ ان کی شیریں بیانی اور بعض اوقات ان کے ڈرامائی حرکات انسان کو پھڑکا دیتی تھیں۔ ان کی گفتگو میں جو سحر تھا وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے ان سے باتیں کرنے میں جو بڑا سبق حاصل ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے ورنہ صحیح نتیجے کا اخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادات کی بندھن ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑیا چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔ اور معمولی سے معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی۔ اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مفید نہیں ہو سکتی۔ لیکن افسوس اب ہم ان کی صحبت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں گو وہ ہم سے تھے مگر ان کی باتیں ہم سے نرالی تھیں ؎

یا وہ جوہر ہی الگ تھا جو ہر انسان سے ۔۔۔ یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

کالج کے قائم کرنے اور اس کی اسکیم کے تیار کرنے میں وہ شروع سے اپنے والد کے موئد اور معین تھے اور خصوصاً سب سے پیشتر کالج کو یونی ورسٹی بنانے کا خیال سیّد محمود کے دل میں پیدا ہوا اور سب سے اوّل اس کی ایک اسکیم انھوں نے پیش کی۔ وہ ہمیشہ کالج کی امداد کرتے رہے، اور دل کھول کے کی۔ سرسیّد احمد خاں مرحوم اپنی اور سیّد محمود کی ان رقوم کا کبھی حساب نہیں رکھتے تھے جو مدرسے کی اعانت میں انھوں نے وقتاً فوقتاً دیں۔ اس لیے ٹھیک اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ علاوہ قلمی امداد کے مالی امداد بھی انھوں نے بہت کچھ دی۔ جو معاملات گورنمنٹ اور کالج کے مابین یا کالج کے یوروپین پروفیسروں سے متعلق ہوتے وہ ہمیشہ مرحوم کے سپرد کیے جاتے تھے۔ اس بارے میں ان کی بعض تحریریں نہایت قابلِ وقعت ہیں خصوصاً کالج کے معزز وزیٹروں وحکّام اعلا کو ایڈریس دینے کی خدمت خاص کر مرحوم کو تفویض کی گئی تھی۔ چنانچہ آخر میں جو ایڈریس ان کے لکھے ہوئے ہیں ان میں اور پہلے کے ایڈریسوں میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔ باوجود اس لیاقت وثروت کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ورنہ چاہتے تو اس قدر شہرت اور دولت حاصل کرسکتے تھے جو دوسرے کی قدرت سے باہر ہے لیکن انھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔ ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم وفضل تبحّر کے رتبے کو پہونچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ شہرت

پر لات مار کر کنج تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں خواہ بادہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو وہ اس ضعف کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر پستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی ہا ہا یا چند سمجھ داروں کی واہ واہ کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو واکرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعینہ یہی حالت اس عزیز کی تھی۔ یہ شیر بیشۂ عزلت کہا کرتا تھا: "کیا حاصل ہے شہرت سے۔ یہی نہ کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالفرض اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دنیا ان کے نام سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کر خوش ہو لیں۔" اسی طرح وہ کہتا تھا کہ "حکومت کیا ہے؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ترتیبِ اشیا کے بدل دینے کا نام ہے۔ اس میں کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ایک شے کو اِدھر سے اُدھر رکھ دیا یا ایک شخص کو یہاں سے نکال وہاں متعین کر دیا۔" اس پاک نفس عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وہ خواجہ حافظ کی غزلیں، قطعات ابن یمین اور عمر خیام کی رباعیات پڑھتا اور مزے لیتا۔ حتیٰ کہ اس پر عمل بھی کرتا۔ وہ اپنی روزانہ ضروریات یعنی کھانا، پینا، سونا، لباس وغیرہ کی جس پر ہم لوگوں کا بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ صرف ہوتا ہے کچھ پروا نہ کرتا۔ اور بے تکلف سادہ زندگی بسر کرتا جس میں نہ نئے فیشن کو دخل تھا اور نہ پرانی وضع کا زور چلتا تھا مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پروا تھا اسی قدر وہ اخلاق

میں مستثنیٰ تھا۔ ایک اجنبی سا اجنبی شخص بھی جب اس سے ملتا تو وہ اس کی وسعتِ اخلاق سے اسی قدر خوش ہوتا تھا جتنا وہ اپنے عمر بھر کے گہرے دوست اور بے تکلّف یار سے مل کر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اخلاق، فیّاضی اور بے تکلّفی کی وجہ سے ادنا اور اعلا اور ہر طبقے اور ہر ملّت کے لوگوں میں مقبول تھا۔ اس عزیز کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی اصل ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی روح کو اگر ایک گاڑی تصوّر کیا جائے تو یہ جوڑی اس کی کھینچنے والی ہے لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی۔ لیکن خدانخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی گئی تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اس کی زندگی کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیوں کہ اب وہ وہاں ہے جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ اور جو کچھ اس نے چھوڑا ہے وہ بھی ایسا کچھ ہے کہ اس کی نظیر نہیں۔ یہ بات کہ وہ اس سے اعلا اور بہتر یادگار چھوڑ سکتا تھا اس کا الزام ہم اس پر نہیں دے سکتے یہ ہماری بدنصیبی ہے۔

دوستو! دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خوبیاں ہوں جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات اور نوادر میں سے ہو تو ایک ایسے شخص کا ہم سے اٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ الم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبھی رکتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے۔ ممکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر سیّد محمود کہاں! اس کی باتیں فسانے

کے طور پر رہ جائیں گی اور مدتوں اس کا ذکر کرکے لوگ اسے یاد کریں گے ؎

دور ہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

حضرات! وہ شخص ہم میں ایسا تھا جیسا پودنوں میں دیو۔ اس کا جسم اور اس کا دماغ دونوں ایسے واقع ہوئے تھے۔ افسوس ایسی نسلیں ہم میں سے مٹی جاتی ہیں۔ عظیم الشان چیزیں گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں لیکن صرف ان کے وجود ہی سے دنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بےچین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے ہمارے قلب پر عجیب و غریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہی حال اُن وسیع نظر عالی دماغ لوگوں کا ہے۔ گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن ان کا اثر نہایت پُر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔ میں اخیر زمانے میں سید محمود کو "ایک شان دار انسانی کھنڈر" کہا کرتا تھا لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ کیا ہم گوارا کرسکتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب و شائستگی کا، دنیا سے نسیاً منسیا ہو جائیں؟ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے اور اس کے ڈھ جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے مٹ جانے کا۔ لیکن افسوس وہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور مادر گیتی کا نہایت لائق فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور اپنے باپ کے پہلو میں وہاں

جگہ پائی جو اس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اسی دُھن میں دُنیا سے گزر گیا جہاں اب تک اس کی روح پھر رہی ہوگی۔ یہاں قوم کے دو سپوت مدفون ہیں گو وہ زندہ نہیں مگر ان کی زندگی کا نشان دُنیا کی رہ گذر میں ایسا گہرا موجود ہے کہ رہ گیر وہاں پہنچ کر ٹھٹک جاتا ہے۔

علی گڈھ سرسیّد اور کالج کی وجہ سے علی گڈھ ہوا اور ایک عالم میں اس کا نام مشہور ہو گیا۔ چنانچہ دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے اور مستفید ہونے کو آتے ہیں۔ لیکن اب علی گڈھ کی عظمت دو چند بلکہ صد چند بڑھ گئی ہے اِس لیے کہ اس میں ایک بدنصیب قوم کے دو بے بہا لعل مدفون ہیں۔ ایک ان میں سے باپ ہے جس نے کسان کی طرح شب و روز محنت کی اور خون پسینہ ایک کرکے اپنی قوت اور کندھے کے زور سے اپنی قوم کو پستی اور ذلّت سے نکال کر دُنیا میں اُبھارا۔ دوسرا بیٹا ہے جو آسمان لیاقت پر شہاب ثاقب کی طرح چمک کر زمین میں غائب ہو گیا۔ یہاں سیّاح اور مُسافر دُور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے۔

صاحبو! ہمیں جو اُس قوم کے اعضا ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیے جن کا ہونا ہمارے لیے فخر ہے اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک ان میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ دُنیا میں اکثر ہوا ہے کہ صرف ایک سپاہی کی ہمّت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پاگئی ہے۔ ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانش مندی سے پار اُتر گئے ہیں۔ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی

سخت ضرورت ہے۔ ان کا ہونا ہمارے لیے نعمت عظمیٰ اور ان کا مرجانا ہمارے لیے ایک بلائے مبرم ہے۔ یہ عزیز جس کی موت پر اظہارِ غم کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں، ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا اب ہم سب کو اس کے لیے دل سے یہ دعا کرنی چاہئے کہ "عاقبتش محمود باد۔"

مولوی چراغ علی مرحوم

سنہ ۱۹۱۰ء

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دُنیا میں جاہ و ثروت و لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلا رُتبے پر پہنچ گئے۔ ان کی تعلیم بہت معمولی درجے کی ہوئی تھی۔ لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی بدولت اُنھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبان دستار فضیلت کو میسّر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو دُنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے نوجوانانِ ملک کے لیے دلیل راہ کا کام دیں گے۔ ان کے آبا و اجداد[۱] دراصل سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک

۱؎ مولوی چراغ علی مرحوم کے ابتدائی حالات ہمیں زیادہ تر مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پوری (حال وظیفہ یاب حسن خدمت سرکار نظام) سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پرانے دوست اور رفیق ہیں۔ اور مرحوم اور ان کے خاندان کو اُس وقت سے جانتے ہیں جب کہ مرحوم کے والد سہارن پور میں ملازم تھے۔ مرحوم مولوی صاحب موصوف کا بہت (باقی صفحہ ۳۰)

مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعدازاں ان کا تبادلہ سہارن پور ہو گیا جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلارک تھے۔ سہارنپور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لیے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ کرانی خانہ منشی خانہ کو کہتے تھے جہاں کلارک کام کرتے تھے۔ چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی داں تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہذا لوگ انھیں کرانی کہنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے معزز ترین عہدہ گورنر جنرلی پر لارڈ ڈلہوزی نئے نئے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب تھے تو کم عمر مگر بلا کے ذہین، جفاکش، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ انھوں نے ملک کی آبادی اور آسائش خلائق عامہ کے لیے بہت سے نیک کام کیے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک کام ان کے ہاتھ سے ایسا ہوا کہ ان کی ساری نیکیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ابتدا سے یہ بات ان کے ذہن نشیں ہو گئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے اور جس طرح بن سکے دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کے ملک کمپنی کے علاقے میں ضم کر لیے جائیں۔ وہ اپنے بہادریں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے۔ وہ اس خیال پر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹) اعزاز و احترام کرتے تھے اور مولوی صاحب کے تعلقات اب تک مرحوم کے خاندان سے ویسے ہی چلے جاتے ہیں اور زمانہ حیدرآباد کے اکثر حالات ہمیں مولوی صاحب موصوف کے بھتیجے مولوی انوارالحق صاحب سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پاس بچپن سے تھے اور مرحوم ان پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ نیز دیگر حضرات سے جو جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ انھیں کے نام کے ساتھ بعد تحقیق کے لکھ دیے گئے۔

اخیر تک جمے رہے اور بڑے تشدد اور استقلال سے اُسے عمل میں لائے لیکن اس سے جو بُرے نتائج پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں اور اس کا بُرا اثر اب تک رعایا کے دل سے پورے طور پر زائل نہیں ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی سے قبل کمپنی بہادر کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے۔ وہ جیسے لڑائی میں سخت تھے ویسے ہی فتح کے بعد معتدل مزاج بھی تھے۔ سکھوں سے پہلی لڑائی فتح کرنے کے بعد بیرونی اضلاع کو الگ کرکے پنجاب انھیں لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنا انتظام خود کرلیں۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ رانی میں اتنی قوت اور دور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھ میں پڑکر ملک کی حالت اور بگاڑ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ایک ایسی اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور مہاراجہ کے دربار کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی اور دستور و آئین کے مطابق اپنا انتظام کرلیں۔ لیکن جب روز بہ روز خرابیاں بڑھتی گئیں تو بمجبوری ایک کونسل مقرر کی گئی کہ اس کی صلاح و مشورے سے انتظام ریاست چلایا جائے اور کونسل کا میر مجلس انگریز ہو۔ پنجاب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ہنری لارنس جیسا نیک دل اور ہوش مند ریزیڈنٹ ملا۔ وہ لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اس خوبی اور نیک نیتی سے کام چلایا کہ رعایا ان کی گرویدہ ہوگئی۔ اتنے میں لارڈ ہارڈنگ ولایت کو سدھارے اور ان کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آئے۔ لارڈ ہارڈنگ کے جاتے ہی سر ہنری لارنس رخصت پر ولایت تشریف لے گئے۔ سر ہنری لارنس

کے جانے کے بعد ناتجربہ کار انگریزی افسروں نے رعایا کی دلداری کا مطلق خیال نہ کیا اور انتظام کے جوش میں ایسی ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے بددلی اور نفرت پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں میں بڑی خوں ریز اور خوں خوار جنگ ہوئی جس سے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ انگریزی حکومت جڑ بنیاد سے ہل گئی۔ آخر انگریزوں کی فتح ہوئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو ہندوستان کے نقشے میں انگریزی کمپنی کی عمل داری کا سُرخ رنگ دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی تھی کہ نقشے کا سارا رنگ سُرخ ہوتا نظر آتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد پوری ہوکے رہی اور اب پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہوگیا۔

اس جدید صُوبے کے انتظام کے لیے ہندوستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لائق عہدے دار منتخب کیے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا۔

۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمۂ بندوبست میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ عہدۂ مہتممی بندوبست پر سرفراز ہوئے۔ اور کچھ عرصے تک صوبۂ پنجاب کے اضلاع ملتان، ڈیرہ غازی خاں، بنّوں وغیرہ میں مامور رہے۔ سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیال کوٹ میں متعین کیے گئے۔ اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتممی بندوبست جیسا وقیع اور اعلا عہدہ جب کہ آج کل بھی دیسی لوگوں کو شاذونادر ہی ملتا ہے تو اس زمانے میں جب کہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کیے گئے تھے اور نہ ان حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معزز نہ سمجھا جاتا ہوگا۔

ہمیں اس سے زیادہ مولوی محمد بخش کے حالات اور اُس وقت کے واقعات معلوم نہ ہو سکے۔ لیکن صرف ایک یہی واقعہ مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی کافی شہادت ہے کہ حکومتِ وقت نے انھیں ایک ایسے عہدے پر جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں سرفراز فرمایا۔

سُنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے متعلق بڑے بڑے خیال تھے لیکن اجل نے مہلت نہ دی اور عین عالم جوانی میں (جب کہ ان کی عمر پینتیس ۳۵ سال سے زائد نہ تھی) سن ستاون کی مشہور فوجی شورش سے ایک سال قبل ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ مرحوم نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے اور اس وقت اُن کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ اب تک میرٹھ میں موجود ہے۔

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل و عیال یعنی اُن کی والدہ، بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی، ولایت علی، عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آ گئے۔

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیرِ سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی اور سوائے معمولی اُردو، فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانے میں کمشنری گورکھپور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس ۲۰ روپے تھی مرحوم کا تقرر ہوا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی

کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیقات اسی زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے منشورِ محمدی، مخبرِ صادق لکھنؤ وغیرہ میں بھی ان کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پور سے بستی میں محکمۂ انجنیری میں مقرر ہو کر آئے اور چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور اُن کے خاندان سے قدیم تھے لہذا دونوں صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں ان کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہو گیا۔ وہاں سے انھوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گوراسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں، اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے۔ چنانچہ اس اطلاع پر غالباً ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنؤ گئے اور مسٹر گوراسلی سے ملے۔ اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی لہذا اس وقت ان کا تقرر اسی خدمت پر بمشاہرہ لعہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہو گئے تھوڑے عرصے کے بعد سیتاپور میں تبادلہ ہو گیا۔

مولوی چراغ علی کا میلانِ طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انھوں نے یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہبِ اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چونکہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لیے مولوی چراغ علی بھی خود بخود امامِ وقت کی طرف جھکے اور وحدتِ ذوق سر سید رح سے اُن کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ اور تہذیب الاخلاق میں بھی اُن کے بعض مضامین شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ جب

سرسیدؒ لکھنؤ تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم اُن سے ملنے کے لیے سیتاپور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ عرصے بعد جب ریاست حیدرآباد سے کچھ کام ترجمے وغیرہ کا سرسید کے پاس آیا تو اُنھوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لے کر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسید کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے ان کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۷ء میں نواب سرسالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک مرحوم) سرسیدؒ سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسیدؒ نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدرآباد چلے آئے۔ جہاں وہ عمدۂ اسسٹنٹ رونیو سکریٹری (مددگار معتمد مال گزاری) پر بمشاہرہ چار سو رُپے مامور ہوئے۔ معتمد مال گزاری اس وقت نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مرحوم تھے۔ اُس وقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلا قابلیت کا ہونا بالکل ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے گی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اُس کی ترقی شاہ راہِ تمدّن پر بہت سست ہوگی۔ دُنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اُٹھائے بغیر دُنیا میں اعلا ترقی کی ہو۔ ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی فتوحات اپنی ذاتی قوت سے دُنیا میں پھیل گئیں لیکن ان فتوحات کو قائم رکھنے یا وسیع کرنے کے لیے یہی کافی نہ تھا پھر جب اُنھوں نے عجم میں قدم رکھا اور امن و جنگ تجارت و سفارت کے ذریعے سے اُنھیں رفتہ رفتہ دوسری اقوام

سے سابقہ پڑا تو اُس وقت سے ان کی ترقی کی بُنیاد مستحکم ہونے لگی۔ آخرانھی لوگوں نے یونان کے علم و حکمت کو زندہ کیا اور تمدّن میں ایسی ترقی کی کہ جس سے ایک عالم میں اُجالا ہوگیا۔ یہی حال یُونان ذرفما اور یورپ و دیگر اقوام کی ترقی کا ہے تازہ مثال جاپان کی ہے وہی جاپان جو اپنے آپ کو غیر ملک والوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا تھا اور غیر صوُرت کو دیکھ کر چونک اُٹھتا تھا آج انھیں سے اُن کے گُر سیکھ کر ان کا اُستاد بنا چاہتا ہے۔ اہل جاپان کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو وہ خود نہیں کرسکتے تھے وہ انھوں نے غیر ملک والوں سے ملازم رکھ رکھ کر لیا اور پھر خود سیکھ کر اُن کی معلّمی سے مستغنی ہوگئے۔ چنانچہ ابتدا میں انھوں نے ریلوے، ٹیلی گراف لائٹ ہوس اور بحری فوج کا انتظام انگریزوں کی سپرد کیا۔ قانونی اصلاح اور فوجی تربیت اہل فرانس کے ہاتھوں ہوئی۔ تعلیمی معاملات، ڈاک خانے کے انتظام اور زراعت میں اہلِ امریکہ سے سبق لیا۔ طبّی تعلیم، تجارتی قواعد، لوکل گورمنمنٹ کا دستوُر اور فوجی افسروں کی تعلیم جرمن والوں کے حوالے کی اور سنگ تراشی (مصوّری) میں اٹلی والوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ غرض ابتدا میں ان سب سے کام لیا اور پھر خود سیکھ کر ان میں ایسا کمال پیدا کیا کہ آج دُنیا کی اعلا دول میں اس کا شمار ہے۔ یہ زمانہ تجربات کا زمانہ ہے اور جاپان نے جو تمدّن کی مختلف اور بیشمار شاخوں میں اس قدر جلد اور قابلِ تعریف ترقی کی ہے اسے اگر اُنیسویں صدی کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سر سالار جنگ اوّل کی تدبیر اور چارہ سازی اور جاپان کی بیداری کا بالکل ایک زمانہ تھا۔ جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے تمدّن کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تدبیر اختیار کی تھی بعینہ وہی تدبیر اُس دور بیں اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کی اور باہر سے قابل، تجربہ کار

اور شائستہ لوگوں کو بُلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کیا۔ پُرانی خرابیوں کی اصلاح کی، نئے نئے دفاتر قائم کیے اور ان کو اصول پر چلایا۔ ملک کے ذرائع آمدنی پر غور کیا اور آمدنی کو بڑھایا۔ تعلیم کو رونق دی، تہذیب و شائستگی پھیلائی، اور ملک اور گورنمنٹ کو خاصا مہذّب اور شائستہ بنا دیا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ ملک وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی امداد بڑی کار آمد اور مفید چیز ہے بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو۔ لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لیے سب کچھ ہوتا چلا جائے تو یہ محض خیال بلکہ جنون ہے۔ اہلِ جاپان میں حُبِّ وطن کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ہر جاپانی اس شدّومد اور جوش سے کام کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی کے سر پڑنے والا ہے اور ہر شخص کی دلی آرزو یہی تھی اور اسی خیال سے محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بٹھا دے اور طرفۃ العین میں اُسے عروس الممالک بنا دے۔ برخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب و خیال سے بھی کوسوں دور ہیں۔ دفاتر اور ہر قسم کے سررشتے جو ایک مہذب ملک میں ہونے چاہئیں یہاں بھی موجود ہیں۔ کونسلیں ہیں، کمیٹیاں ہیں، قابل سے قابل ڈگری یافتہ افسر بھی ہیں، کمیٹیاں ہوتی ہیں، تجویزیں پیش ہوتی ہیں، رزولیوشن پاس ہوتے ہیں، نئی نئی اسکیمیں جاری ہوتی ہیں، رُپیہ وصول ہوتا ہے، ذرائع آمدنی بھی سوچے جاتے ہیں، رپورٹیں بھی لکھی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن حیات کا نام نہیں۔

سرسالار جنگ نے اس تدبیر کے ساتھ بڑی دانش مندی یہ کی تھی کہ ابتدا میں انھوں نے قابل لوگوں کو سرسید سے طلب کیا۔ یہ دو عالی دماغ شخص سرزمین

ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ انیسویں صدی کے مسلمان اُن پر جتنا فخر کریں بجا ہے۔ اور ایسے وقت میں ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ سر سیّد کے انتخاب اور سر سالار جنگ مرحوم کی قدر دانی اور کار فرمائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح جو لوگ انتخاب کیے گئے انھوں نے اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کیے۔ اور وہ ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ اُنھیں میں سے ایک مولوی چراغ علی مرحوم بھی تھے۔

ابتدا میں مولوی چراغ علی کا تقرر مددگاری معتمد مال گذاری پر بمشاہرہ چار سو رُپے ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد سات سو رُپے ہو گئے۔ بعد ازاں عہد وزارت نواب عماد السلطنۃ مرحوم میں جب نواب محسن الملک مرحوم معتمد پولیٹکل و فینانس مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمد مال گزاری پر بمشاہرہ پندرہ سو رُپے ہوا۔ عہد وزارت سر آسمان جاہ بہادر مرحوم میں جب کہ بہ مصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) معتمد مال گذاری مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی صوبہ داریٔ ورنگل پر مامور ہوئے اور پھر صوبہ داریٔ گلبرگہ پر تبادلہ ہو گیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک مرحوم کے چلے جانے پر معتمد مال و فینانس مقرر ہوئے۔

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانب داری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انھیں پر سے وہ بلا رو رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ حیدرآباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ وہ روزانہ سوا ننے

اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے۔ جب کام بہت سا جمع ہو جاتا تھا تو دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے تھے۔ وہ کبھی طول طویل فیصلے نہیں لکھتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ اُن کی تحریر جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی یہی حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ لفظ اشدِ ضروری سے اُنھیں سخت چڑ تھی، اور اس قسم کے جو مراسلات آتے تھے وہ انھیں اُلٹا کے پھینک دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ سمجھتے سمجھاتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشدِ ضروری لکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا، جو اشدِ ضروری لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدار المہام بہادر کے ہاں کمیٹی تھی، اُس میں اُن کے بعض ہم عصر و ہم رتبہ معزز عہدے داروں نے مدار المہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشدِ ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمایئے میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لاؤ۔ صندوق آیا اور انھوں نے مدار المہام بہادر سے مخاطب ہو کر کہا کہ سرکار دیکھیے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا۔ سب کے سب بند پڑے ہیں۔ اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اُٹھا لیتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ان میں سے ایک لفافہ اُٹھا لیا، اُسے کھولا تو اُس میں یہ لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیا جائے۔

مراسلہ پڑھ کر سنانے کے بعد مدارالمہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ یہ کون سا اشدِ ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشدِ ضروری کے معنی نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ اشدِ ضروری لکھ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ "شاید سال بھر میں دو تین ہی اشدِ ضروری واقعات پیش آتے ہوں گے۔ ان حضرات نے ہر ایک بات کو اشدِ ضروری خیال کر لیا ہے۔

مولوی طالب الحق صاحب مددگار صدر محاسب جو سرکار عالی کے ایک نہایت متدین، قابل اور تجربہ کار عہدہ دار ہیں اور سر سالار جنگ مرحوم کے زمانے سے اب تک مختلف عہدوں پر رہے ہیں اور خود بھی مولوی چراغ علی مرحوم کے تحت میں کام کر چکے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے سرکار عالی میں ایسے ایسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا سابقہ ہوا ہے جو اپنے اپنے کمال اور خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے، لیکن مرحوم میں بعض ایسی خصوصیات تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے بڑی غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے، اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اُس سے کبھی نہ ٹلتے تھے، گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ مولوی صاحب موصوف نے راقم سے ایک خاص معاملے کے متعلق ذکر کر کے فرمایا (اور اس کی مسل کا بھی حوالہ دیا) کہ مرحوم کی زمانۂ مددگاری میں سر سالار جنگ مرحوم نے مولوی صاحب مرحوم کی رائے سے اُس میں اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رُجحان معتمد (نواب محسن الملک مرحوم) کی رائے کی طرف ہے۔ اور مولوی صاحب مرحوم کی رائے پر چند سوالات کیے۔ مرحوم نے نہایت مدلّل جواب دیا۔ اس پر پھر کچھ سر سالار جنگ مرحوم نے اعتراض اور سوال کیے، ادھر سے پھر اس کا جواب ادا کیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبہ ایسے ہی

سوال وجواب ہوئے، اور آخر نواب مدارالمہام بہادر مرحوم قائل ہوگئے اور یہ تحریر فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ اپنی رائے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بیشک آپ کی رائے صحیح اور دُرست ہے۔ اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور اُن کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر ادا ہوجائے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے، نہایت تیز فہم اور صائب الرائے تھے۔

جناب مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس وحال وزیر جاورہ جو مولوی چراغ علی مرحوم کے بہترین جانشین ہوئے اور بوجہ اپنی اعلا قابلیت، تدین، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں۔ راقم سے فرماتے تھے کہ ایک بار سر وقارالامرا بہادر مرحوم فرمانے لگے کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب وغریب آدمی تھے۔ اور اس کے بعد انھوں نے ایک پارسی جنٹلمین کا واقعہ بیان کیا جسے وظیفہ رعائتی یا رقم دینے کے متعلق نواب صاحب مرحوم نے حکم دیا تھا۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے معاملے کو ڈال رکھا تھا۔ اُس نے آکر نواب صاحب سے شکایت کی کہ معتمد صاحب کچھ فیصلہ نہیں کرتے اور معاملے کو ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے پھر حکم لکھا۔ مولوی صاحب مرحوم پھر چپ سادھ گئے۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد پھر شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا، مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بیچارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملے میں تگ ودو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہاں

دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہو کر پھر نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رویا دھویا۔ نواب صاحب مرحوم جو مروّت کے پُتلے تھے فرمانے لگے کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا جس روز مولوی صاحب بارگاہِ وزارت میں حاضر ہوئے تو اس نے یاد دہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے فلاں معاملے میں آپ کو تین بار حکم دیا، مگر آپ نے اب تک اس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور مسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھ دی۔ نواب صاحب نے کسی قدر جھنجھلا کے کہا کہ میں مسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے اب تک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مولوی صاحب نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ اِس لیے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لُٹا دیں۔ آپ کا کام خزانے کی حفاظت ہے۔" یہ جواب سُن کر نواب صاحب مرحوم بالکل ساکت رہے، اور پھر کبھی آپ نے مولوی صاحب سے اس معاملے کے متعلق تحریک نہ کی۔ یہ واقعہ خود نواب وقارالامرا بہادر مرحوم کی زبانی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سوائے مولوی چراغ علی کے کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے ان کی اخلاقی جرأت اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی سیّد علی حسن صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اضلاع پر سے جو تختے (گوشوارے) آتے تھے اور اُن پر جو مولوی صاحب مرحوم تنقیح کرتے تھے اس سے اُن کی دقتِ نظر اور اعلا درجے کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدے دار کہ بڑے بڑے دورے کرتے ہر معاملے کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے۔ ان سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں

ڈرتے تھے، جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تختوں کی تنقیح سے۔
مطالعے میں بیحد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی، اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے۔ اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں، اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سوگئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے اتنے میں پھر آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسہ حرفت وصنعت اورنگ آباد فرزند مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو اُن کے سینہ پر سے کتاب اُٹھا کے رکھوں، ورنہ کتاب کے جلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے۔ تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہواخوری میں تو البتہ جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف وتصنیف میں صرف ہوتا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ اُن کا کتب خانہ قابل دید تھا اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔ مطالعے میں انھیں محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے انھیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مولوی سیّد تصدّق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو جو بہت باوضع اور ہم درد بزرگ ہیں، علاوہ قدیم تعلقات کے ایک مدّت تک شب وروز مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مرحوم کے ملازم کلّو کی زبانی فرماتے تھے کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اُس میں ڈرائنگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے

اُس کے نیچے تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹھ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب مرحوم اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اتفاق سے تہ خانے میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگی، مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ گئی، مگر آپ جس طرح کتاب پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق صاحب نے اپنا ایک چشم دید واقعہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے۔ یا تو یہ دونوں واقعے ایک ہیں یا کلّو کے بیان میں غلطی ہو گئی ہے مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے اور اس سے اُن کے استقلال طبع کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے اپنا چشم دید بیان کیا ہے کہ ایک مقام پر تانگے میں سوار دورہ کر رہے تھے۔ رستے میں تانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے تانگے کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کی مالہ و ماعلیہ کے سُراغ میں پتّے پتّے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہونچاتے، چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کو بغرض تلاش کتب مصر روانہ کیا تھا۔ مولوی عبد اللہ صاحب مرحوم نے جو خط مرحوم کو مصر سے لکھا تھا وہ ہم نے دیکھا ہے۔ اور بعض اوقات ایسے ایسے

مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ ان کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب سابق اسسٹنٹ سکریٹری پولیٹکل فنانس و ناظم مردم شماری (اسوشئنٹ رائل اسکول آف مائنز، فیلو آف دی جیولاجیکل سوسائٹی وغیرہ وغیرہ) راقم سے فرماتے تھے کہ جب برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرولر جنرل مقرر ہونے کی خبر آئی تو چونکہ مولوی صاحب مرحوم فنانشل سکرٹری تھے، انھیں فکر ہوئی۔ آخر انھوں نے فنانس پر انگریزی میں جس قدر مستند اور اعلا درجہ کی کتابیں تھیں سب منگوالیں، اور ان کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینے میں اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی اور فنانشل معاملات پر گفتگو آئی تو وہ مولوی صاحب کے وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا۔ اور پیانو پر گتیں نکالنی شروع کیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدوّن کریں۔ چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا اور اس کا ناتمام سا مسودہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن اس کام کے لیے بڑی فرصت درکار تھی لہذا اسے انجام نہ دے سکے۔ علم ہیئت میں بھی انھیں خوب دخل تھا۔

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ چنانچہ سرسیدؒ ان کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دست گاہ رکھتے تھے، عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے، فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کالدی

زبان میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے، لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلا درجے کے مصنف تھے، انگریزی زبان میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں" زیادہ تر اُن کی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں جن کا مفصل ذکر ان کی مذہبی تصانیف میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ لیکن یہاں اس قدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن کی ابتدائی تعلیم خاص کر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی تھی لیکن انھوں نے صرف اپنے مطالعہ کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت اور دست گاہ حاصل کرلی تھی۔

یہ صرف ہم اُن کی مطبوعہ کتب کو ہی دیکھ کر نہیں کہتے بلکہ ہم نے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی دیکھے ہیں۔ ان کی انگریزی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو ریویو کیے ہیں اُن میں اُن کی انگریزی تحریر کی بھی تعریف کی ہے۔ ہم بطور نمونہ یہاں ایک دو ریویوؤں سے صرف ان کی انگریزی دانی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں۔

اے تھی نیم نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے ان کی کتاب زیر دیباچہ پر ایک بڑا ریویو لکھا ہے۔ لکھتا ہے کہ "مولوی صاحب کی انگریزی قابلِ قدر ہے" (بابتہ ۵ر جنوری ۱۸۸۴ء)۔

بمبئی گزٹ جو بمبئی پریسیڈنسی کا بہت قابلِ قدر اخبار ہے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے" (بمبئی گزٹ بابت ۱۲ر جولائی ۱۸۸۲ء)۔

جرنل آف دی انجمن پنجاب نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اس میں لکھتا ہے کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع و مذہبِ اسلام کا بڑا عالم ہے"

مولوی انوارالحق صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے سیّد محمود مرحوم

کا خط مولوی چراغ علی کے نام دیکھا جس میں سیّد محمود مرحوم نے مولوی صاحب کے وسیع معلومات اور ان کی انگریزی دانی اور انگریزی تحریر کی بڑی تعریف کی تھی۔

علاوہ مذہبی تصانیف کے جن کا ذکر مفصّل طور پر الگ کیا جائے گا یہاں اُن کی بعض اُن تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہی جو انھوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

(۱) بجٹ (موازنہ) سب سے اوّل مولوی چراغ علی مرحوم نے تیار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہوگیا ہی اور خاصہ ایک دفتر ہی۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہی جو اختصار اور صفائی اُس موازنہ میں پائی جاتی ہی وہ موجودہ موازنہ میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل موازنہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہی لیکن بفحوائے الفضل للمتقدم فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم ہی کے سر رہے گی۔

(۲) اڈمنسٹریشن رپورٹ (رپورٹ نظم ونسق، بابت ۱۲۹۳ف ۱۸۸۴ء) لکھی جو چھ سو تینتیس بڑے بڑے صفحوں پر ہی۔ اس قسم کی پہلی رپورٹ ہی اور بعد ازاں جتنی رپورٹیں لکھی گئیں وہ سب اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

(۳) حیدرآباد (دکن) انڈر سر سالار جنگ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہی اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور بے مثل کتاب ہی۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جاں کاہی سے کام لیا ہی۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں اُن تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہی جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں لیکن جس انتظام اور صیغے پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہی، اُسے ابتدا سے لیا ہی اور اس کی اصل، تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہی اور اُس کے متعلق تمام

مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیّا کر دیا ہے۔ علاوہ اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات سے بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ہے، انھیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس کتاب کو مولوی صاحب مرحوم نے نواب سر سالار جنگ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اگرچہ کتاب نواب صاحب مرحوم کے زمانے میں آپ کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہوگئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل راہئ ملک بقا ہوگئے۔ بعد میں فاضل مؤلف نے اپنی احسان مندی کے اظہار میں نواب مرحوم کے نام سے اُسے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو کیے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت و تحقیق کی داد دی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ اپنے نمبر مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۸۸۴ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصّے میں بڑی محنت اور احتیاط صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ وہ حصّہ ہے جس میں موجودہ نظم و نسق کی کیفیت درج ہے۔ اس میں متجسّس ناظرین اُن مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرزِ عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سر سالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جب کہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی اور انھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی۔"

اِسی طرح اُس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر کارڈری نے اپنے خط مورخہ ۶ر اکتوبر ۱۸۸۴ء

میں جو مولوی صاحب مرحوم کے نام ہے اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہے۔

اسی کا ایک ضمیمہ صرف خاص انڈر سر سالار جنگ ہے۔ جن میں ان اصلاحات و ترقیات کا ذکر ہے جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانش مندی سے علاقہ صرف خاص میں عمل میں آئیں۔

(۴) جاگیرات و جاگیرداران۔ افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیرداران ممالک محروسہ سرکار عالی کی اصل اور تاریخ، ان کا رقبہ اور آمدنی، پیداوار، حرفت و صنعت اور دیگر تمام دل چسپ اور مفصّل حالات درج کریں۔ لیکن اس کے لیے انھیں مواد بہم پہنچانے میں بہت دقّت پیش آئی۔ یہاں کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے مدا ور مراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی۔ اور ان کے بعد جو لوگ عہدۂ فنانشل سکرٹری پر اُن کے جانشین ہوئے اُن میں سے نہ کسی کو اس سے دل چسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دل چسپ ہوتی بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لیے مفید ہوتا۔

غرض مولوی چراغ علی مرحوم نہ صرف بحیثیت ایک مصنّف کے بلکہ بحیثیت ایک عام انسان کے بھی ایک عجیب و غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے۔ اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جُدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ

ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور سے قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے دوسرے انھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ وہ ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوا دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جز بز ہوتے تھے، کبھی اخبار اُٹھا لاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے، اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچّوں سے بے تکلّف باتیں کرتے تھے اور اُن سے مزے مزے کے سوالات کرتے، اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح وبسط اور خوبی کے ساتھ دیتے۔ مثلاً اگر کسی بچّے نے کسی پودے کی نسبت پُوچھا تو آپ پورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشوونما اور آب وہوا اور زمین کے اثر کا بیان کر دیتے اور ان چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب وتمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچّوں میں جو بھولاپن، خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلّفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنّع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے، پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا، خوردی وبزرگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچّے پیارے ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی سنانے والا ہو تو اس وقت انھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ رُپے پیسے کی بالکل محبت نہیں تھی۔ بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے۔ نہ کبھی کسی معاملے میں اُن سے باز پرس کرتے، اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے اُن کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی خفا ہونا تو درکنار انھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیونکر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔ مولوی صاحب مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد علی صاحب جو نیک سیرتی اور سادگی میں اپنے والد مرحوم اور چچاؤں کی سچّی یادگار ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ رات کا کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ جب ہم نے کام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر سوئے، پھر اٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے اور پھر سو گئے، اور اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کسی دوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ چونکہ ذیابیطس کی شکایت تھی، پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت وہ اکثر کام کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بیکار ضائع جانے نہیں دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعے یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے انھیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں ہی سے نہ تھا بلکہ بیوی بچوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے۔ کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے۔ کوئی کچھ کہا کرے، انھیں جو کچھ کرنا ہوتا کر گذرتے۔

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہر کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ
حالی

وقار اور متانت اُن پر ختم تھی۔ اِستقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کبھی نہ چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اسلام کے سچّے حامی تھے، اور ان کی عمر اور محنت کا زیادہ حصّہ اسی میں گزرا۔ اُن سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یورپین مصنّفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سر سیدؒ جن کی کتاب "خطبات احمدیہ" کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل مولوی سیّد امیر علی بالقابہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں اُس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اُن کے حریف ریورنڈ کینن میکال نے ان کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملّت سے انھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ گزشتہ مردم شماری سے قبل جب مردم شماری ہوئی تو انھوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھ دیا، لیکن اپنے اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیئے اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔

اس موقع پر یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جس وقت، ہم

مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انھوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب "براہین احمدیہ" کی تالیف میں مدد طلب کی تھی، چنانچہ مرزا صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کا افتخار نامہ محبت آمود ...... عزورود لایا اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیّت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوّت و حقیقت قرآن شریف میں ایک عرصے سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعثِ اشتعالِ شعلۂ حمیّتِ اسلام علی صاحبہ السّلام ہوا اور موجب ازیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اوالعزم صاحب فضیلت دینی و دنیوی تہ دل سے حامی ہو، اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہئے۔ جزاکم اللہ نعم الجزاء ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے طبع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں۔ ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں" آپ کے مضمون اثبات نبوّت کی اب تک میں نے انتظار کی، پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا۔ اس لیے آج مکرّر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں، اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علی حقانیۃ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں اور اپنے مختصر کلام سے ان کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں

اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرما دیں۔" اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوت اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "دوسری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے، اور اُمید کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت دیانند کی وید بھاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں، اور اُن کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے۔ لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہوں، اُن اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلّمہ آریہ سماج کی وید اور منو اسمرت ہے، اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں۔ میں اس جستجو میں ہوں کہ علاوہ اثبات نبوّت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہنود کے وید اور اُن کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلاف حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کیے جائیں اپنے دین کی طرف داری سے باز نہیں آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ کرلیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیے کے کتاب کے اندر درج کروں گا۔" ایک اور خط مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فرقان مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ

عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں، تاکہ اسی رسالے میں حسب مواقع اندراج پا جائے۔ یا سفیر ہند میں .... لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانہ گزشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں، کہ منقولات مخالف پر حجّت تو نہیں آسکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عند العقل اس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیئے۔ بہرصورت میں اُس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم اذا وعد وفا مضمون تحریر فرما دیں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے اور آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دنداں شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں، وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ" اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جزو ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپے ہے، اور آپ کی تحریر ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی"

ان تحریروں سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت و حفاظت اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ یعنی خود وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی احمد حسن صاحب امروہی نے اپنی کتاب "تاویل القرآن" شائع کی تو

مولوی صاحب مرحوم نے بطور امداد سو روپے مصنف کی خدمت میں بھیجے۔ اسی طرح جو لوگ حمایت اسلام میں کتابیں شائع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کی کتابوں کی خرید فرماتے تھے چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب "پیغام محمدی" کی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے، چہرے سے ان کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ ان کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے، جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل وصورت کے لوگوں پر اُن کے علم وفضل اور قابلیت کا بھی رُعب پڑتا تھا۔

حیدر آباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اسی طرح سے رہے، جیسے طوفانِ موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالانکہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش، کسی پولیٹکل، سوشل تحریک میں ان کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی اُمور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے، اُن کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا۔

پاک ہیں آرائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
حالی

جو لوگ یہاں کام یابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے، اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بار آور ہیں، اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

بارے دُنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو
میر

وفات

اگر صد سال مانی ور یکے روز   ببابد رفت زیں کاخِ دل افروز

مرحوم کو ذیابیطس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسی کے اثر سے ایک گلٹی دہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرے کے نیچے نمودار ہوئی۔ ڈاکٹر ہیر اُن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر لاری مشہور سرجن و سابق ناظم محکمۂ طبابت سرکارِ عالی کی یہ رائے ہوئی کہ عمل جرّاحی کیا جائے۔ اس وقت تک مرحوم بالکل تندرست اور صحیح معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے۔ چنانچہ حسب مشورۂ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یکبارگی فرق آگیا اور ضعف طاری ہو گیا۔ بعد ازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردی ہوتی گئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حالانکہ یہ زخم بہت ہی نازک ہو گیا تھا اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی۔ جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اسے اندر باہر سے صاف کر کے دھوتا تھا، تو مولوی صاحب

خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، کیا مجال جو زبان سے اُف نکل جائے، یا تیور سے کسی قسم کے درد یا تکلیف کا اظہار ہو۔ چونکہ حالت ناقابلِ اطمینان تھی لہذا مولوی صاحب اور اُن کے اعزّہ و احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جا کر علاج کیا جائے۔ چنانچہ روز سہ شنبہ بتاریخ ۱۱ ر جون ۱۸۹۵ء مرحوم مع اہل و عیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، حالت بہت ردی ہو چکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جان دار بچ نہیں سکتا آ پہنچا۔ پندرھویں جون روز شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفس شروع ہو گیا اور گیارہ بجتے بجتے دارِ فنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کر کے راہی ملکِ بقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ، وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔ مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اِنسان نہیں رہتا، لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کے بھی ہے یعنی پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں، اور بفضلِ خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بقیدِ حیات ہیں۔ اور اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جان دار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنا اور حقیر جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ ان کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو

کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے کیرکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں، اُن کا کیرکٹر اور اُن کا کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم اُن کی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں، اُن کا ترجمہ کرتے اور انھیں یاد کرتے ہیں اور ان کے نیک نام اور کام کی یاد دوسروں کو دلاتے ہیں بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔

مرحوم کی وفات پر تمام اُردو، انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس و ملال کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہم بخوفِ طوالت صرف دو تحریروں کو نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم (مدار المہام) وقت کا اظہار افسوس جو اُنھوں نے سرکار کی طرف سے کیا۔ اور جو جریدۂ اعلامیہ سرکارِ عالی میں طبع اور شائع ہوا۔ دوسرا سر سیّد کا نامۂ الم جو اس دردناک خبر کے سُنتے ہی اُنھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچّی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ، بے لوث، مستقل مزاج، تجربہ کار عہدے دار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا۔ اُدھر قوم میں سے ایک حامیٔ ملّت اور فاضل محقّق گُم ہو گیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اُٹھایا ہے اُس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور زمانۂ آئندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کرے گا لیکن ایسے دُھن کے پکّے، دُنیا و مافیہا سے بے خبر اور اپنے کام میں ہمہ تن محو، مشکل سے پیدا ہوں گے۔"

(از جریدہ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ، جلد بست و ششم نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الٰہی ۱۳۰۴ فصلی مطابق سی ام ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ)

"نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فینانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیلِ آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدے دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی مکرّر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ طبقۂ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا۔" (صفحہ ۳۹۵ نشان ۱۶۴)

(از تہذیب الاخلاق علی گڑھ) سلسلہ سوم جلد دوم۔ مطبوعہ یکم محرّم الحرام ۱۳۱۳ھ ہجری)

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتے کی بیماری میں انتقال کیا۔ اُن کا خط خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا تھا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ تین ہفتے سے بیمار ہوں، ڈاڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے۔ ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جائے کلوروفارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلوروفارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں، کھاتا پیتا نہیں، چلنا پھرنا موقوف مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے اور ارادہ ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے بمبئی جاؤں۔

اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے انھیں کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آگیا ہوں۔ افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب ہم بعض کاغذات اُن کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے۔ اُسی وقت اُنھوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے، ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے، حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے اُن کو بلایا تھا، اُس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر اُن کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ اُن کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلا درجے کی دست گاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کالدی میں نہایت اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلا درجہ کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی اُنھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں، کہ ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی، نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو اُنھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا۔ اور اب اُمید نہیں کہ

کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔

سید محمود مرحوم (خلف سر سیدؒ) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی۔

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

۱۸۹۵ء

مولانا حالی مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے۔

زخمے از مرگِ چراغ علی آمد بر دل / کہ از و خاطرِ افگار بصد غم شدہ جفت

از خرد سالِ وفاتش چو بجستم محمودؔ / "شد نہاں حیف چراغ علی از دُنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے وہ یہ ہے۔

آہ آہ! از رحلت بے گاہِ اعظم یار جنگ / کز میانِ رہ زہمراہاں عناں پیچید و رفت

حیف دُنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع / بزمِ ما را بزمِ ماتم باز گردانید و رفت

مستفیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز / مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت

از سحابِ فیضِ کلکش ناشدہ سیراب خلق / ساعتے برقِ یمانی از اُفق تابید و رفت

عقدہا ناکشودہ ماند و نکتہا نانوشتہ ماند / بہر جوئے شیر کوہِ بے ستوں کندید و رفت

کرد بے آزارِ خلق اعمالِ سُلطانی ادا / نے ز کس رنجید و نے کس را برنجانید و رفت

یاوراں قوم را تا زیست یاور بود و یار / ہر چہ بتوانست در تائیدِ شاں کوشید و رفت

از دل پُر دردِ او گاہے صدائے برنخاست / مدتے چوں بحرِ کامل در نہاں جوشید و رفت

طبعِ آزادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت / در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت

گر زید صد سال کس انجام او مرگست و بس — چوں شررِ وضع دوراں میتواں خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریاکوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک حیدرآباد میں ملازم تھے اور اب وظیفہ یابِ حسنِ خدمت ہیں' ایک اچھا قطعۂ تاریخ لکھا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آں گرامی معتمد کز حسن رایش بید رنگ — یافت آبے در رکن مال و خزانہ آب و رنگ
محکم اخلاصِ دلی با ملّتِ اسلام داشت — در معیشت بود رفتارش بر آدابِ فرنگ
علم را جوہر شناسے، قدر دانِ اہلِ علم — طالبِ حکمت نگہ دارندۂ آئین ہنگ
با علوِ فکر تش مرغِ ہما برکندہ بال — عقل کل در مرغ زارِ جودتش آہوئے لنگ
با سبک روحی متینے بود چوں کوہِ گراں — کلکِ او در دشتِ معنی برق رفتارے سرنگ
بہر معنیہا دلش دریائے گوہر خیز بود — وقت گویائی دہانش بود شکر بار تنگ
شد نمایاں ناگہاں از گوشۂ رخسار او — دانۂ ریشِ قضا چیزے کم از قدر مشنگ
بارہا از بہر اصلاحش برو نشتر زوند — تاشد از نشتر زنیہا کار بر بیمار تنگ
رفتہ رفتہ شد بس ابتر حالِ او در چند روز — بود گویا صورتِ تصویر بر پشت پلنگ
عاقبت بیوقت مرگ از گلشنِ گیتی ربود — آنچنانش کز کمیں سال نشیناں را نہنگ
الغرض چوں رختِ ہستی بست از دنیائے دوں — ہاتفی گفت از جلالی، وائے اعظم یار جنگ
۱۳۱۲ھ

سیّد محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سنہ عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہی تھیں، جو یہ ہیں:۔

(۱) ہاتفی گفت از سرِ افسوس — گوہرِ شب چراغ بود نماند
۱۸۹۵ء

(۲) ہائے اعظم یار جنگ
۱۳۱۲ھ

مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم

۱۹۱۲ء

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایسے شخص کی موت جس سے دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا کی بہبودی وابستہ ہو، جس پہ قوم کی رہبری اور سرداری کے لیے ملک کی نظرِ انتخاب ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں ہزار حسرت و افسوس کے قابل ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

مرحوم لڑکپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور آنرز کے ساتھ بی، اے کا امتحان پاس کیا اور علی گڑھ کالج کے نہایت قابل اور سعید سپوتوں میں سے تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدر آباد آئے اگرچہ ابتدا میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے انھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور مددگاری ہوم سکرٹری سے ہوم سکرٹری کی معزز اور اہم خدمت پر فائز ہوئے۔ ان کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدر آباد دکن میں ضرب المثل ہے وہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے۔ معاملات کی تہ کو

اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا وہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دشوار منزلوں کو انھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی اُن کی طبیعت پر گراں نہ گزرا۔ جو کام دوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے وہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق نظری کے ساتھ کہ کیا مجال کہ کوئی بات رہ جائے۔ اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کیے۔ اور نہ کبھی کام کرنے سے اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا۔ جب بعض وجوہ سے وہ خدمت ہوم سکرٹری سے اوّل تعلقداری پر بھیجے گئے تو حالانکہ انھوں نے کبھی مال گزاری کا کام نہیں کیا تھا لیکن اپنے فرضِ منصبی کو اِس خوبی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوئی اور سرکاری رپورٹوں میں متواتر ان کی کارگزاری پر اظہارِ خوشنودی کیا گیا۔ اور ادھر رعایا اس قدر خوش تھی کہ ہندو مسلمان اُن کے تبادلے پر آنسو بہاتے تھے۔
اس کے بعد وہ مجلس عالیہ عدالت کے رُکن (جج ہائی کورٹ) ہوئے اور باوجودیکہ انھوں نے کوئی قانونی امتحان پاس نہیں کیا تھا لیکن یہاں بھی وہ اپنے کام میں ممتاز رہے۔ تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اُسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ پھر اسی جاں گزا اور طمانیت سوز خدمت ہوم سکرٹری پر سرفراز کیے گئے۔
اس زمانے میں مرحوم نے ریاست حیدرآباد کی تعلیم پر خاصی توجہ کی اور ایک ایسا قابلِ تعریف نوٹ ریاست کی تعلیمی حالت پر لکھا جو یادگار رہے گا۔ نیز اس میں ایسی ایسی مفید تجاویز پیش کی ہیں کہ اگر اُن پر کافی طور سے عمل کیا گیا تو ملک کی خوش قسمتی سمجھی جائے گی اور جب کبھی ریاست

کی تعلیمی حالت میں اصلاح کا خیال پیدا ہوگا تو اسی داغ بیل پر چلنا پڑے گا۔ مرحوم کی ذہانت، قابلیت وسعتِ معلومات پر ایک عالم گواہ ہے۔ باوجود کثرتِ کار کے علمی شوق اُن کے دم کے ساتھ رہا۔ ہندوستان کے مشہور اُردو رسالوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس میں اُن کے بیش بہا مضامین طبع نہ ہوئے ہوں۔ اور پبلک انھیں ہمیشہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ مرحوم مقرر بھی تھے اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے۔ لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شان دار ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بعض مضامین اُردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ مرحوم کو علم تاریخ سے خاص دل چسپی تھی۔ محمود گاوان کی سیرت پر جو رسالہ لکھا ہے اُس سے ان کے تاریخی تجسّس و تلاش کا پتہ لگتا ہے۔ اُردو ادب میں بھی انھیں ویسا ہی ذوق تھا جو دکرم اروسی زکالی داس کے ڈرامے کے ترجمے) سے صاف ظاہر ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کوئی علمی اور سوشل مجلس اور سوسائٹی ایسی نہ تھی جس کے وہ پریزیڈنٹ یا وائس پریزیڈنٹ نہ ہوں۔ مثلاً دائرۃ المعارف نظام کلب۔ کتب خانہ آصفیہ علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن، انجمن اُردو وغیرہ وغیرہ سب ان سے فیض یاب تھیں۔ انجمن قائم کرنے والے یا کسی عارضی جلسے کے منعقد کرنے والے اوّل ہی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مولوی عزیز مرزا اس کے صدر ہوں گے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ مرحوم حیدرآباد کی تمام قومی ملکی اور تمدّنی تحریکوں کے روح رواں تھے اور اس کا سب سے قوی ثبوت یہ ہے کہ جب سے مرحوم حیدرآباد سے گئے ہیں حیدرآباد جیسا شہر سنسان ہوگیا اور کسی قسم کی تحریک کا نام تک زبان پر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس دم کے ساتھ تھا جو خود علمی ذوق اور قومی درد رکھتا تھا اور

دوسروں میں اس احساس کی قدر کرتا تھا۔
اس سے بڑھ کر دوسری بات جس نے مرحوم کو عام و خاص، امیر و غریب، ادنا و اعلا سب میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا ان کی وسعتِ اخلاق تھی۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے یکساں خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے تھے، ہر ایک کی سنتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، نخوت و رعونت چھو نہیں گئی تھی، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی وہ مساوات کا برتاؤ کرتے تھے، ان کا گھر پبلک کا گھر تھا اور صبح کے ۶ بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور باوجودیکہ ان کے کاموں میں ہرج ہوتا اور بعض اوقات تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر بھی مل لیتے تھے۔ لوگوں کی مقصد برآری اور سفارش کرنے میں بڑے دلیر تھے اور کبھی کوئی شخص اُن کے در سے مایوس ہو کر نہ گیا۔ ان کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے اور ہر شخص آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔ افسوس کہ ان کے جاتے ہی یہ چرچے حیدرآباد سے اُٹھ گئے اور اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے۔ ظریف اور خوش طبع بھی تھے۔ ان کے مزے دار لطیفوں اور چٹکلوں کا اُن کے دوست اب تک مزہ لیتے ہیں۔ اُن کی مجلس سے شاذ و نادر ہی کوئی شخص ناخوش اور مایوس ہو کر آتا۔ مذہب کے بہت پابند تھے۔ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں نماز قضا نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا۔ باوجود اس جاہ و منصب اور قیامِ حیدرآباد کے کبھی بھولے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے۔ وہ بہت متقی اور پرہیزگار تھے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ان کی طرزِ معاشرت پُرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ مرحوم بہت صاف گو تھے، جو دل میں آتا فوراً زبان سے کہہ دیتے تھے اور اس صاف گوئی سے اُنھیں بعض اوقات نقصان بھی پہنچا۔ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن پھر جلد صاف بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا فیض عام تھا دوست دشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے اُن سے بُرائی کی اُنھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے کیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر انھوں نے دشمنوں کو نوازا۔ مرحوم بہت رقیق القلب تھے۔ کسی کی درد بھری داستان سُن کر خود اُن کا دل بھر آتا تھا۔ ان کی تنخواہ کا ایک حصّہ دوسروں کی دستگیری میں صرف ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس کبھی رُپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دُنیا سے کوچ کیا۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب وغریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف وحوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے۔ اور کچھ نہیں تو کاہل تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن مرحوم کی جفاکشی ومستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا، وہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے سے نہ بھٹکے۔ ان کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا پہلے تھی ویسے ہی آخر دم تک رہی۔ اور اُن کے اتقا اور پرہیزگاری میں کبھی تزلزل واقع نہ ہوا۔ لیکن آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا۔ مگر بے عیب ذات خدا کی ہے۔ کون ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور خاص کر یہ ضعف نہ ہو۔ لیکن اس عزیز مرحوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں

جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اس کا جانشین نہیں ملتا۔ خصوصاً حیدرآباد میں لوگ انھیں زمانۂ دراز تک یاد رکھیں گے۔ اُن کی بھلائیاں اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

حیدرآباد سے جانے کے بعد انھوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کردی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ اُن کے حوالے کردی گئی تھی۔ ان کے سکرٹری ہونے سے قبل لیگ برائے نام تھی، مرحوم نے اُسے زندہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دورہ کرکے اُس کے دائرۂ افادہ کو وسیع کیا اور اہلِ کمال اس کے کاموں کی قدر کرنے لگے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یہ مسلمانوں کی حمایت میں سب سے پُرزور آلہ ثابت ہوتی۔

مرحوم کی عمر پورے پچاس برس کی بھی نہ تھی کہ پیامِ اجل پہنچا۔ اب تک وہ طالب علمی اور ملازمت کے دھندے میں گرفتار رہے تھے۔ حال میں مکروہات دُنیا سے فارغ ہوکر قومی کارزار میں بڑی مستعدی سے قدم رکھا تھا اور یقین تھا کہ وہ سب سے زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جب ایامِ ملازمت میں انھوں نے اس قدر نمایاں کام کیے تو بعد فراغت وہ کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن افسوس کہ عین وقت پر اور نہایت بے وقت انھیں کوچ کرنا پڑا اور ملک وقوم کی بہت سی توقعات اور آرزوئیں اُن کے ساتھ خاک میں مل گئیں۔

جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں پر ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں اب تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے پُرانے بزرگوں کی طرح ملک وقوم کی خدمت بے نفسی اور ہمدردی کے ساتھ کی ہو۔

یہ اعتراض بہت کچھ صحیح ہے اور اکثر اس کے جواب میں ہمیں ساکت ہونا پڑا۔ لیکن اب ہم بلاخوف تردید مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کو پیش کرتے ہیں جو بالکل جدید تعلیم یافتہ تھے مگر ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جن کی ملک و قوم کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ ایام طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے انھوں نے اپنے فرض منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہوگئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے بھی خوش اسلوبی، بےنفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حب وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

شمس العلماڈاکٹر مولوی سیّدعلی بلگرامی

۱۹۱۴ء

شمس العلماڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی مرحوم ہندوستان کے عہدِ جدید کے اُن نامور علمار میں سے ہیں جنھوں نے علوم والسنۂ مشرقیہ ومغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدّن علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے۔ یہ لوگ درحقیقت جدید تعلیم کے رہبر درہنما ہیں اور ان کے متعلق وہ شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی جو اس وقت انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے متعلق عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدیم علوم وتہذیب سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں جس سے حمیّتِ قومی میں ضعف پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ اس نقص کی طرف بہت جلد مبذول ہوگئی جس کی اصلاح کی ہر طرف کوشش کی جارہی ہے۔

مرحوم بلگرام کے ایک نہایت شریف ونجیب خاندان سے تھے اور یہ خاندان مسلمانوں کے اُن معدودے چند خاندانوں سے ہے جنھوں نے ایسے زمانے میں جب کہ ہند میں مختلف قوتیں کام کررہی تھیں اور باہمی کشمکش سے ملک میں بے اطمینانی تھی زمانے کا رُخ پہچانا اور عاقبت اندیشی اور دوربینی سے کام لے کر اُدھر کو چلے جدھر زمانہ جارہا تھا اور جس کے آگے آخر سب کو جھکنا پڑا۔

ان کے آباؤ اجداد شہر واسط سے جو عراقِ عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہو چھٹی صدی میں ہندوستان آئے اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ ان کے جدّ امجد مولوی سید کرامت حسین خاں بہادر والسرائے کے دربار میں شاہِ اودھ کی طرف سے قائم مقام تھے۔ بعد الحاق ان کے والد اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلا اور معتبر خدمات پر سرفراز رہے۔

اُن کے چچا سید اعظم الدین حسن خاں لارڈ ولیم بنٹنگ کے مصاحب (اے، ڈی، سی) اور اورنٹیل انٹرپریٹر (ترجمانِ السنہ مشرقیہ) تھے اور بعد میں سندھ میں پولیٹکل ایجنٹ مقرّر ہوئے اور دریائے سندھ کی نگرانی بھی انھیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو نہ مجال تھی۔ لیکن چونکہ امیرانِ سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا نہیں پسند کرتے تھے اس لیے اعظم الدین خاں کا انتخاب کیا گیا جس سے ان کی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہو۔ آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) بر سبیلِ تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اہلِ سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سید ہیں تو ان کے بنگلے پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے اور بیماروں کے لیے تعویذ مانگنے آتے تھے۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ فرصت کے بعد عربی کے اشعار یا قرآن کی آیات جو اُس وقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکرے میں ڈالتے جاتے تھے اور دوسرے روز لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔ اور اُن میں سے اکثر اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تاکہ لوگ بدگمان نہ ہو جائیں۔ مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے۔ چونکہ

بہت وجیہ گورے چِٹے تھے لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ دراصل یہ انگریز ہی لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اس لیے وہاں عام طور پر برہمی پیدا ہو گئی یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انھیں بھی اس کی اطلاع ہو گئی اور یہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ دو بار لیجسلیٹو کونسل کے ممبر انتخاب ہوئے۔ بہار میں ڈپٹی کلکٹر ڈپٹی مجسٹریٹ اور افسر بندوبست رہے دیسی طبقے میں سی۔ ایس۔ آئی کے پہلے گروہ میں سے تھے۔ غدر کے زمانے میں انھوں نے آرہ ہوس کے بچانے میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گاریسن ہاؤس کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم کے والد سیّد زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدے پر مامور رہے اور سنہ ۱۸۴۰ء سے ۱۸۷۵ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی خدمت پر تقرر ہوا۔

مرحوم کے چچا اور والد مشرقی علوم والسنہ کے عالم اور فاضل تھے اور بعد ازاں انھوں نے مدرسۂ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں قائم کیا تھا۔ تعلیم پائی، ہندوستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

مولوی سیّد علی مرحوم اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۰ر نومبر ۱۸۵۱ء میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علومِ عربیہ حاصل کیے۔ کہتے ہیں کہ حافظہ ان کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ پندرہ سال کی عمر

میں عربی، فارسی تعلیم سے فارغ ہوکر ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی انھوں نے خوب ترقی کی۔ دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے اور ۱۸۷۴ء یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی، اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرّس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اس کے بعد تین سال تک قانونِ ملکی مطالعہ کیا اور سال بھر بعد امتحان نیٹو سول سروس میں کام یاب ہوئے اور کل ضلع بہار میں نمبر اوّل رہے۔ بعد ازاں طامسن اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی انجنیرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ ابھی چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ حیدر آباد دکن کے نامور مدبر اور عالی دماغ وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اوّل نے جن کی قدر دانی اور جوہر شناسی مشہورِ آفاق ہے۔ انھیں حیدر آباد میں طلب کر کے اپنے پرسنل اسٹاف میں داخل کر لیا اور ولایت جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئے اور لندن کے شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اور بجائے تین سال کے دو سال میں الیوشی ایٹ کا امتحان بدرجۂ اعلا پاس کیا اور علم طبقات الارض میں مرچی سن تمغہ پایا۔ علاوہ اس کے کیمسٹری، طبیعات، مکانیک، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیوٰۃ وغیرہ علوم میں دست گاہ وافر حاصل کی۔ پروفیسروں نے اُن کی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلا درجے کے صداقت نامے دیے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے بزمانہ قیام انگلستان ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر ٹنڈل وغیرہ جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے ۱۸۷۹ء میں

لندن یونی ورسٹی کا امتحان میٹرکولیشن بدرجۂ اعلا پاس کیا تھا اور اس امتحان میں ان کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انھوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا، اور اتالی زبانوں اور علوم کی تحصیل کے لیے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا۔ اور اس طرح علومِ مغربی و مشرقی سے بہرہ ور ہو کر حیدر آباد واپس آئے۔ جہاں سرکارِ عالی نے انھیں اِنسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے۔ مرحوم پہلے مسلمان تھے جو بارہا مدراس یونی ورسٹی کے امتحان ایم، اے کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے اور ویدوں اور ویدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کئے۔ میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سنا ہو کہ ان کا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہو۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہو کہ وہ جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلاتکلف پڑھتے جاتے تھے۔

مرحوم آخر عمر تک (باستثنائے بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔ سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت میں بعض انقلابات سے بددل ہو کر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری اس وقت کی جب کہ کلکتہ یونی ورسٹی کے امتحان بی، ایل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے لیکن حیرت کی بات ہو کہ اس امتحان میں تمام یونی ورسٹی میں اوّل رہے

اور طلائی تمغہ، یونی ورسٹی لا اسکالرشپ اور رچی انعام کتب حاصل کیا۔ اس سے پہلے کلکتہ یونی ورسٹی میں کسی مسلمان اُمیدوار کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ امتحان اُنھوں نے نومبر ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔ اس سے مولوی سید علی مرحوم کے خداداد حافظہ اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہی۔ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ ہند نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلا شبہ وہ اس کے مستحق تھے۔

۱۹۰۱ء میں بعض پولٹیکل وجوہ سے ایک بیش قرار وظیفہ (ا۱ہار ماہانہ) لے کر خدمت سے علٰحدہ ہوگئے اور انگلستان میں جا کر مقیم ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونی ورسٹی میں مرہٹی زبان کے ریڈر مقرّر کیے گئے۔ اسی سال انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ بہت بڑا ذخیرہ ہی جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں۔ اس کی فہرست کا ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا بلکہ ایک اہم کام خیال کیا گیا تھا۔ انڈیا آفس لائبریری کا یہ حصّہ "دہلی مینوسکرپٹ" (قلمی نسخہ ہائے دہلی) کے نام سے مشہور ہی۔ یہ دلّی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیج دیا گیا۔

شاہجہاں نے پورب کو شیراز کہا تھا، لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہی۔ یہ عجب مردم خیز خطّہ ہی۔ اسی قصبے میں سیّد مرتضیٰ صاحب تاج العروس علّامہ سید عبدالجلیل و مولانا آزاد وغیرہم جیسے فاضل پیدا ہوئے اور اس آخری دَور میں شمس العلما سیّد علی مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولوی سیّد حسین نواب عماد الملک بہادر سی۔ ایس۔ آئی کا شمار بھی انھیں باکمال علما میں ہوسکتا ہی۔

مولوی سید علی مرحوم بلاشبہ مختلف علوم والسنہ کے عالم تھے لیکن جب

ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکشی اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب وہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اُس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے اور خاص کر علمی کاموں کے لئے زیادہ راس بھی نہ تھے، یہ سرزمین آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے کچھ ایسی انقلاب انگیز واقع ہوئی ہے کہ ہر دَور میں ایک نہ ایک طوفان بپا رہا ہے۔ گو اب جنگ وجدل کا زمانہ نہیں رہا، طوائف الملکوکی اور غارت گری کا دور ختم ہو چکا ہے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ نکل آتا ہے کہ چین سے بیٹھنا اور اطمینان سے کام کرنا نصیب نہیں ہوتا اور خصوصاً مرحوم کی سی بےچین اور متلوّن طبیعت کے لیے اس دلدل سے نکلنا بہت دشوار تھا۔ لیکن باوجود اس کے مرحوم علمی کام کی طرف سے غافل نہ رہے، اگرچہ ان کا کام زیادہ تر بلکہ کل کا کل ترجمے ہی تک رہا۔ لیکن اس زمانے میں بہ نسبت ناقص اور فضول تالیف و تصنیف کے غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بسا غنیمت اور قابل قدر ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی اور خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مدّ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے۔ اگر غیر زبانوں کی علمی اور اعلا تصانیف کے ترجمے ہو جائیں تو یہ آئندہ دور کی تالیف و تصنیف کے لئے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا۔ یہاں ہم مرحوم کی تالیفات و تراجم کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

(۱) مڈیکل جورس پرو ڈنس یعنی اصولِ قانون متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطبّا و وکلا اور حکامِ عدالت کے عام ناظرین کے لیے بھی دل چسپ ہے۔

(ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہی) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہی۔ بہ زمانۂ وزارت سر آسمان جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو چھ ہزار رُپے بطور صلہ عنایت فرمائے۔ اس کتاب میں ایک امر یہ بھی قابلِ لحاظ ہی کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہی۔

(۲) رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ۔ اس میں مرحوم نے مشہور و معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہی اور اس امر کے پتا لگانے کی کوشش کی ہی کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہی، پھر کہاں گئی اور کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیّرات عمل میں آئے۔ مرحوم کی یہ مختصر تالیف بہت دل چسپ اور قابلِ قدر ہی۔ اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں پڑھا تھا۔ مرحوم فرماتے تھے کہ بہ زمانۂ قیامِ لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانوں کے تمدّن و علم و ادب کا ذکر تھا، ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا اسی میں مرحوم نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور اُن کے کارنامے دُنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابیں کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ باقی رہ جائیں تو ان کے کارہائے نمایاں کے لئے کافی ہیں۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلہ پر بھی لکھیں اور اس کے لئے دو الماری بھر کتابیں جمع کی تھیں۔

(۳) فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ

(۴) غارہائے الورہ کا گائڈ

(۵) حیدر آباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات

(۶) تمدّنِ عرب۔ موسیولیبان کی فرانسیسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ عربی و اسلامی تمدّن پر بہت دل چسپ اور مفید کتاب ہے۔

(۷) تمدّنِ ہند۔ یہ کتاب بھی موسیولیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا مفصّل ذکر اس دیباچے کے دوسرے حصّے میں کیا گیا ہے۔

(۸) مرحوم نے موسیو سدیو کی کتاب تمدّن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اُردو میں کیا تھا، لیکن جب اُنھوں نے یہ سُنا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔ حالانکہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا اس لئے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا بلکہ صرف اس کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے۔

مرحوم نے حیدر آباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ الحقائق نامی ۱۸۸۹ء میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ اس رسالے میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے، لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بہادر مولوی سیّد حسین بلگرامی، علّامہ مولوی سیّد علی شوشتری، ڈاکٹر لائٹنر، مولوی سیّد کرامت حسین صاحب جج الہ آباد جیسے فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہے کہ استقلال کے ساتھ کام نہ ہوا اور رسالہ کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان اور دیگر ممالک اسلامی میں تعلقات و روابط قائم رکھنے اور ایک کو دوسرے کے خیالات وحالات سے آگاہ کرنے کا ذریعہ عربی زبان ہی ہو سکتی ہے نیز یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آئندہ اسلام کی ترقی و عروج میں عربی زبان کو بہت بڑا دخل ہوگا۔ اس لئے کہ اس وقت مختلف اسلامی ممالک میں

باوجود موجودہ انحطاط و انتشار کے باہمی اتحاد اور ہم دردی قائم رکھنے والی علاوہ دیگر اسباب کے ایک عربی زبان بھی ہے اور آئندہ چل کر بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنے میں مدد دے گی۔

اپنے زمانۂ ملازمت میں مرحوم نے ایک بہت قابلِ قدر کام کیا تھا اور اگر وہ جاری رہتا اور قاعدے سے چلایا جاتا اور اس کا چلانے والا ایسا شخص ہوتا جس کے دل میں علمی ترقی اور قومی ہم دردی کی آگ ہوتی تو وہ بڑی برکت و خیر کا باعث ہوتا۔ مرحوم نے نواب سروقارالامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدرداں امیر تھے، ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اُردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے۔ مرحوم اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے اور اُن کی زیرِ نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لیے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا لہذا انھوں نے شمس العلما مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمتِ ناظم سررشتۂ علوم و فنون پر بمشاہرہ للعٰہ ہوا اور درحقیقت یہ اِنتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سررشتہ ٹوٹ گیا اور کام اب تک بند ہے۔ جس ضرورت سے یہ سررشتہ قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے اور جب سے شمالی ہند و دیگر حصص ملک میں اُردو پر لے دے ہوئی ہے یہ ضرورت اور نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اُردو کی سرپرستی تین مقامات میں خاص طور پر ہوئی۔ ایک تو پنجاب میں، دوسرے علی گڑھ اور تیسرے حیدرآباد دکن میں۔ پنجاب میں اس نے

بانی ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ تھے۔ ان صاحبوں کی تحریک سے پنجاب یونیورسٹی نے بیش بہا اور گراں قدر انعامات کے ذریعہ سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اُردوٗ زبان میں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں اور یہ سلسلہ ایک مدّت تک جاری رہا۔ لیکن حال میں اس عام مرض کی وجہ سے جو ملک کی بدقسمتی سے ہر جگہ شائع ہوگیا ہے بعض حضرات نے وطن پرستی کے پردے میں پنجابی کو اُردوٗ کا حریف بنا کر لاکھڑا کیا ہے اور پنجاب یونی ورسٹی نے اُردوٗ کی سرپرستی سے کسی قدر اپنا ہاتھ روک لیا ہے۔ اب اُردوٗ کو صرف ایک دولتِ آصفیہ کا آسرا رہ گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردوٗ زبان کو علاوہ اس کے کہ دکن نے اس کی نشو ونما میں ابتدا سے بہت بڑا حصّہ لیا ہے اور مختلف وجوہ سے بھی دولتِ آصفیہ پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار عالی نے عربی فارسی اُردوٗ تصانیف کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اب بھی جاری ہے، لیکن خاص اُصوٗل اور جوش کے ساتھ یہ کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ اب کہ سب طرف سے مایوسی ہے سرکار عالی کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلے پر غور کرکے اس مفید اور ضروری کام کو اُصوٗل کے ساتھ چلائے۔ اور نہیں تو کم سے کم پنجاب یونی ورسٹی کی طرح متعدد بیش قدر انعامات مقرر کرکے عام طور پر اشتہار دے اور علمی کتابیں اُردوٗ میں لکھوائے یا ترجمہ کرلے تاکہ مولفین و مترجمین کی ایک حد تک حوصلہ افزائی ہو سکے۔ اس پر توجہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی پبلک میں اس قدر قدر شناسی کا مادّہ پیدا نہیں کہ مصنّفین و مولفین اس کے بھروسے پر بڑے بڑے کام کرسکیں۔ اِس لیے ضرورت ہے کہ ایک زمانے تک اس کے سر پر حکومت و دولت کا ہاتھ رہے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجے شوق تھا چنانچہ ایک نہایت عمدہ

کتاب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو قریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاص کر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم و علم ادب پر اس زمانے میں شائع ہوئی ہیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں اور صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کے مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کیے ہیں جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کسی دوسری جگہ ایسا بے بہا مجموعہ موجود نہیں۔ کاش کوئی خدا کا بندہ جس کے دل میں درد ہو یہ کتاب خانہ خرید کر مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کی نذر کر دے تاکہ کالج جب حقیقی یونی ورسٹی بن جائے تو یہ اس کے لئے باعثِ رونق و افادہ ہو اور اس کے محسن کو زندگی جاوید حاصل ہو۔

مرحوم ہمیشہ عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے چنانچہ کتاب الوصایا لابو حاتم السجستانی کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے کتب خانہ میں تھا۔ فرانس کے کسی عالم نے بغرض طبع طلب کیا کیونکہ دنیا میں اس کتاب کا اور کوئی نسخہ نہیں ہے جب کتاب کتب خانے کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی ہے کہ فرانس پہنچتے پہنچتے آٹا ہو جائے گی تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کا فوٹو لے لیا جائے۔ چنانچہ دس کاپیاں بذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مرحوم کے ولایت پہنچنے سے چار روز پہلے سب کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ مرحوم کو جب معلوم ہوا تو اس پروفیسر کے پاس پہنچے جس نے فوٹو لیا تھا اور جا کر

بمنّت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتب خانہ کے لئے ہے مگر چونکہ آپ مجھ سے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں لہذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں چنانچہ وہ نسخہ اب تک مرحوم کے کتاب خانہ میں موجود ہے۔ اس کی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مرحوم نے جمہرۃ اللغہ لابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپے میں خریدی۔ ان کے ایک معزز دوست جو حیدر آباد میں ایک اعلا خدمت پر تھے ان سے مستعار لائے اور کچھ عرصے بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کردی۔ مرحوم بھول بھال گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانے میں آئے اور اس کتاب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانے میں بھی موجود ہے دیکھنے کے لیے طلب کی تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ تو انھیں کا ہے اور جب اس کے فروخت کی کیفیت سنی تو بہت رنج ہوا۔ آخر بڑی احتیاط سے اس کی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی اُسے بیحد پسند آئی، چونکہ روپے کی ضرورت تھی لہذا پندرہ ہزار میں فروخت کردی۔

تزک بابری کا کامل نسخہ اب تک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوا۔ اصل ترکی نسخہ ایک سینٹ پیٹرز برگ میں ہے اور دوسرا فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں۔ مرحوم نے ترکی تزک کا کامل نسخہ نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانے میں دیکھا اور وہ اسے انگلستان جاتے وقت اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائٹیوں میں جب تزک کا ذکر آیا تو مرحوم نے اس قلمی نسخے کو پیش کیا بعد مقابلہ اور تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ سوا اِس

نسخے کے باقی جس قدر نسخے دُنیا میں اس تک معلوم ہوئے ہیں ناقص ہیں چونکہ تصحیح کے لیے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں تاخیر بھی بہت ہوتی ہے لہذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لے لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخے میں درج ہے۔ چونکہ اس زمانے میں جاگیر نواب سرسالار جنگ مرحوم محکمۂ مال گزاری کی نگرانی میں تھی۔ بعض حسّاد نے محکمۂ مال گزاری میں یہ شکایت کردی کہ مولوی سیّد علی ایک نایاب کتاب کتب خانے سے لے گئے ہیں اُن کو لکھا جائے یا تو کتاب واپس کریں ورنہ اُن کے وظیفے سے اس کی قیمت وضع کرلی جائے۔ چنانچہ محکمۂ مال گزاری کی طرف سے یہی لکھا گیا۔ مرحوم نے اس کے جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اس کے عکسی نسخے کی معتمد مال گزاری کی خدمت میں بھیج دی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کردیا ہے۔

مرحوم کو ابنِ عرب شاہ مصنّف تاریخ تیموری کی ایک دوسری نادر الوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت میں دستیاب ہوئی۔ مرحوم نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع کرانا شروع کیا، لیکن دورانِ طبع میں وجع مفاصل کا مرض لاحق ہوگیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

مرحوم کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں، ایک مرتبہ ان کی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدل دی جائے۔ موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتاب کتب کے حروف تہجی پر تقسیم کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنّف کی اس میں کون کون سی کتابوں کا

ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ مرحوم نے یہ تجویز کی تھی کہ کل کتاب کے مصنّفین کو حروف تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنّف کے نام کے ذیل میں اس کی تصانیف لکھ دی جائیں تاکہ جب کوئی مصنّف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اس کے حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں۔ چنانچہ اس کام کے انجام دینے کے لئے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس برس تک پندرہ رُپے ماہانہ خرچ کرتے رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ چونکہ مرحوم میں استقلال نہ تھا اس لئے یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہنچا۔

اسی طرح مرحوم کو اگسٹس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی میں اور دوسری جلد میں اس کا قیمتی انڈکس یورپ میں شائع کیا ہے جس کے طفیل میں قرآن کی ہر سورت اور ہر آیت آسانی سے نکل آتی ہے جو مصنّفین و مولفین کے لئے نہایت کارآمد اور مفید ہے، لیکن اس میں ہر آیت اور سورت کے لئے صرف ہندسوں کا نشان ہے۔

مرحوم یہ چاہتے تھے کہ بجائے ہندسوں کے سورت کا نام لکھ دیں۔ چنانچہ اس طریقہ پر انڈکس مرتب کر لیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ بیروت میں طبع کراکر کم قیمت پر فروخت کیا جائے لیکن طبع کی نوبت نہ آئی۔

مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی اُن سے ملنے جاتا تو اس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب صاحب علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ سروقارالامرا بہادر مرحوم

کے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر تشریف لائے ہیں۔ مرحوم نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کرو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی خاطر سے ترک نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمایئے، اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے۔ وہ صرف اہلِ علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ اُن کے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا حالی کی اُن کے دل میں بہت وقعت تھی۔ چنانچہ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ حیاتِ جاوید چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خاں صاحب کے پاس کچھ نسخے آئے ہیں تو رات کو آٹھ بجے کتاب منگوائی اور اُسی وقت مطالعہ کرنا شروع کیا اور بہت سا حصّہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کیے نہ چھوڑی۔ ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی کی ہشتاد سالہ سال گرہ پر اس کے شاگردوں اور مداحوں نے اس کی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھ کر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرائے جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کے لیے نہایت موزوں اور عمدہ یادگار ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے یہ تجویز کی کہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ مولانا حالی کی علمی خدمات کی شکر گزاری کی یادگار میں ایک ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا اور راقم سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجات طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں تمدّنِ ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو اوّل صبح کو اٹھ کر

چند ورق حیاتِ جاوید کے پڑھ لیتے تھے اور اس کے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے۔

ایک بار حیاتِ جاوید کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلّی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی و راہبر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثوں میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے۔ زبان دلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں ان کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی۔

مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمہ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ تمدنِ عرب میں جابجا آیات قرآنی کا ترجمہ اسی ترجمے سے لیا ہے۔ ایک روز مولوی عبداللہ خاں صاحب نے جن سے مرحوم کو بہت خصوصیت تھی اور ہم کو اُن سے مرحوم کے اکثر حالات معلوم ہوئے ہیں۔ آیت استویٰ علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "عرش پر جا براجا" مرحوم پھڑک اُٹھے اور کہا کہ استویٰ کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

مرحوم جب نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے ساتھ شملے تشریف لے گئے تو مولوی سیّد احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے اپنی تالیف ارمغانِ دہلی کے بعض اجزا پیش کئے۔ مرحوم نے ان کی بڑی تعریف کی اور سفارش کر کے پچاس رُپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اور انعام کے لیے خود گزارش لکھ کر سرکار میں پیش کی۔ سرکار عالی سے بعد ازاں مؤلف کو گراں قدر انعامات عطا ہوئے۔

مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار رُپے کی ڈگری ہو گئی

جس سے وہ بہت پریشان تھے اُنھوں نے مرحوم کو اطلاع دی مرحوم نے کل رقم اُن کے پاس بھجوادی۔

مرحوم بہت بامروّت تھے۔ اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اُسے پوری نہ کرسکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد برآری میں کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں ان کے دینے میں بھی تامّل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچّا قدردان ہو خاص کر طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خاں، مرحوم کے یہاں مدعو تھے ۱۲ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم نے ان کی درخواست پر فوراً کامل مبرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستّر روپے ہے مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالبِ علم جو خود کتابوں کا شوقین ہے اہلِ علم کی درخواست رد نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ۱۳۰۹ھ میں جب سرسیّد مرحوم آخر بار حیدرآباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکارعالی کے مہمان ہوکر فروکش ہوئے تو چونکہ مرحوم کو اپنے کتب خانے کی نادر کتب کے دکھانے کا شوق تھا سرسیّد کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانا شروع کیں منجملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اوّل سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں۔ سرسیّد مرحوم نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ کالج کی لائبریری میں رہے تاکہ مسلمان

اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ مرحوم نے کہا بیشک اسی قابل ہی اور چلتے وقت وہ نسخہ سرسید کی گاڑی میں رکھ دیا۔

مرحوم نے ردالمنطق لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کی نذر کی تھی۔ اِنگلستان پہنچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہی آپ وہ نسخہ بھجوا دیجے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سُست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لئے آپ طلب کرتے ہیں۔ مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پانسو رُپے کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں[1]۔ چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کے مُرتّب کرنے کے لیے حیدر آباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے مرحوم سے ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے مڈبھیڑ ہوگئی تو مرحوم اُسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔

جب اہلِ علم میں سے کوئی شخص حیدر آباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ان کا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدر آباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے۔ مرحوم کو جب دوسرے روز اِطلاع ہوئی تو فوراً آ پہنچے اور اپنے گھر لے گئے۔ لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اُٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج اُن کے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہی۔

---

[1] مولانا شبلی فرماتے تھے کہ یہ واقعہ بالکل غلط ہی۔ چونکہ میں نے سید علی مرحوم سے سُنا تھا اِس لیے لکھ دیا تھا۔

مرحوم اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی رکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت انگیز کام کر جاتے تھے۔ چنانچہ علاوہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعہ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ مرحوم کے والد مولوی سیّد زین الدین خاں صاحب کی عمر کا اکثر حصہ پٹنہ میں صرف ہوا تھا اور مولوی خدا بخش خاں صاحب کے والد اور مرحوم سے بہت تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولوی خدا بخش خاں مرحوم کسی مقدمے میں وکیل ہو کر حیدر آباد تشریف لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے مرحوم ہی کے مکان پر ٹھہرے۔ انھیں ایام میں ایک بار اُنھوں نے مرحوم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا وکیل ہوں، اگر آپ کی سعی سے سرکار عالی مجھے وکالت درجۂ اوّل کی سند عطا کر دے، تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے اس میں مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے ہی روز میر افضل حسین صاحب مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ (چیف جسٹس ہائی کورٹ) کے یہاں پہنچے اور بہت منّت اور لجاجت سے اظہارِ مطلب کیا اور کہا کہ مولوی صاحب ہمارے والد کے دوست اور ہمارے بزرگ ہیں۔ اگر آپ کی عنایت سے ان کا یہ کام نکل جائے، جو کوئی بڑی بات نہیں، تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ مگر میر صاحب مرحوم نے کچھ ایسا غیر متوقع اور دل شکن جواب دیا کہ اس کے بعد مرحوم نے مولوی خدا بخش کا اُن سے تعارف کرانا بھی پسند نہ کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے۔ جب راستے میں تمام واقعہ مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب مرحوم کو بے انتہا رنج اور مایوسی ہوئی۔ مرحوم نے کہا آپ دل شکستہ اور مایوس نہ ہوں، اگر میر افضل حسین صاحب نے سند نہیں دی تو

کچھ مضائقہ نہیں، انشاء اللہ اب ہم کوشش کریں گے کہ آپ خود میر مجلس ہو جائیں اور دوسروں کو سندیں عطا کریں۔ چنانچہ مرحوم نے جان توڑ کے کوشش کی اور آخر مولوی خدا بخش خاں کو میر مجلس کرا کے رہے۔

مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت کے لیے رُپیہ طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ حیدر آباد کے ایک صحّاف نے اُن سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کے لیے دیجیے۔ مرحوم نے ایک کتاب دی اور کہا اگر تم عمدہ جلد باندھو گے تو ہم تمھیں اور کام دیں گے۔ جب وہ جلد باندھ کے لے گیا تو مرحوم نے بہت پسند فرمائی اور اس کے کام کی تعریف کی۔ صحاف نے کہا سرکار یہ کیا کام ہے افسوس سامان نہیں، اگر میرے پاس سامان ہوتا تو پھر آپ میرا کام دیکھتے۔ مرحوم نے فوراً اُسے دو ہزار رُپے کا سامان اور ضروری مشینیں منگوا دیں۔ مطبع شمسی (حیدر آباد) بھی اسی قبیل سے ہے اور مرحوم کے فیض کی یادگار ہے۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے۔

مرحوم اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی سمجھے جاتے تھے، لیکن وہ تعصب سے بالکل بری تھے اور شیعہ سُنّی کی تفریق کو بہت بُرا خیال کرتے تھے۔ حالانکہ مرحوم کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا، یہ عجیب بات ہے کہ اس میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔

چنانچہ جب مرحوم کتب خانہ دیکھنے کے لیے رام پور گئے تو نواب صاحب رام پور سے بھی کتب خانے کے متعلق ذکر آیا۔ نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے فرمایا کہ "ہم نے وہ کام کیا جو ہمارے اجداد نے نہیں کیا تھا یعنی اس کتاب خانے میں سُنّی مذہب کی کتابیں تو جمع تھیں ہی، لیکن ہم نے

مذہبِ شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں خصوصاً ملّا محمد باقر مجلسی کی بحار الانوار کی پچیس جلدیں جو حال ہی میں طہران میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں۔"
مرحوم نے فرمایا کہ "شیعوں کی مذہبی کتب محض بیکار ہیں اور ہرگز قابلِ استدلال نہیں۔ جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جن کے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے اسقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملّا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے۔"
نواب صاحب نے فرمایا کہ "اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ اہلِ بیت نبوی کے فضائل جو سنّیوں نے خصوصاً بخاری و مسلم کے جامعین نے قلم انداز کر دیئے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔" مرحوم نے کہا "یہ بھی ایک مہمل بات ہے نبی رُوحانی و اخلاقی اصلاح کے لئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہلِ بیت کے محامد بیان کرنے کے لیے۔ ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہلِ بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلافِ آداب سمجھتا ہے، نبی کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا اُن سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلافِ قیاس ہے۔"

ایک روز مرحوم نے فرمایا کہ کیمبرج یونی ورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا میں نے پوچھا "تم حضرت عمر سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟ ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علی کی پیروی کرتے ہیں۔" اس پر میں نے کہا کہ حضرت عمر اور حضرت علی میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کبھی نہ کرتے۔" ایرانی نے تعجب سے پوچھا "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ مرحوم نے اپنے کتب خانے سے فوراً تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو کہ شیعہ مذہب کا عالم ہے لا کر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی تھی اور

جس کے دیباچے میں مصنّف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی عالم اس کتاب اور واقعہ کو دیکھ کر تائب ہوگیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی حضرت عمر کو بُرا نہ کہوں گا اور تعجب کیا کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو کیوں چھپاتے ہیں۔

قیامِ بلدۂ حیدر آباد میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا، ایک روز راقم مولوی عبداللہ خاں صاحب اور ظہیر الدین فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی تشریف لائے۔ مرحوم نے عبداللہ خاں سے کہا کہ ذرا یعقوبی کی تاریخ جلد دوم تو اندر سے لے کر آؤ۔ جب وہ کتاب لے کر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اس میں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں، تو مرحوم نے اُن کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک مقام پر سے پڑھ کر سنانی شروع کی۔ یہ وہی مقام تھا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس کے بعد شیعہ عالم سے مخاطب ہوکر کہا کہ "آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری بیوی میں بحث ہو رہی ہے، وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا اور اس قدر مہر مقرر ہوا تھا، اور ان سے ایک بیٹا مسمیٰ زید پیدا ہوا تھا۔" اس پر حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علمائے شیعہ اس واقعہ کے منکر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جبر و اکراہ کا نکاح تھا۔ مرحوم نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہے، دُنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہ کی لڑکی کو علیؓ سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کرلے؟" آخر مولوی صاحب خفیف سے ہو کے رہ گئے اور جواب نہ بن پڑا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ خلفائے اربعہ کے مناقشات اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ مرحوم نے

فرمایا کہ "خلفائے اربعہ میں کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی تو تھی نہیں، اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب میں۔ مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اس کے لئے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی، اور اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے۔"

شیعہ سنّی کے جھگڑے کے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹکل جھگڑا ہے۔ ان کے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے، مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کر دیں لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزز ممبر نے انھیں لکھا کہ "میرا ارادہ ہے کہ آپ کا نام اب کی سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے تجویز کروں اور مجھے قوی امید ہے کہ سب ممبر اسے خوشی خوشی قبول کر لیں گے۔ آپ کے انتخاب کے لیے تین بڑے وجوہ ہیں اوّل آپ شیعہ ہیں، دوسرے عالم ہیں۔ تیسرے صاحب مال وجاہ ہیں۔" مرحوم نے جواب میں لکھا کہ "جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لیے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ میں عالم ہوں، یہ غلط ہے میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ مال دار ہوں، یہ بھی صحیح نہیں، البتہ اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں شیعہ ہوں یہ سچ لیکن میں سلمہ ہجری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے کی میں نے ذرا

بھی کوشش نہیں کی ہے۔ علاوہ اس کے میں اس قسم کی کانفرنسوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جب کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے اور اسی لیے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

ایک روز شمس العلما مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے کیوں عداوت ہے حالانکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے اور بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی اُن سے دشمنی ہوتی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر۔ فرمایا کہ آدھی اسلامی دُنیا حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اُٹھتے بیٹھتے اُن کا نام لیتی ہے۔ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے۔ اگر اسی طرح آپ کی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

مذکورۂ بالا واقعات سے مرحوم کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔

مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدر داں تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثنا خواں تھے اور جس قدر مختلف نسخے اُن کے پاس بکنے آتے وہ خوشی خوشی انھیں خرید لیتے تھے حالانکہ متعدد نسخے موجود تھے۔

اگرچہ مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت قومی اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانی اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔

قیامِ انگلستان میں وہ اکثر ہندستانی اور دیگر بلادِ اسلامی کے طلبہ اور مقیم اصحاب کی دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بذریعہ ٹیلی فون ان سے دریافت کیا۔ اُن کے افسر نے نہایت خوشی کے ساتھ دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لیے بڑی عزّت اور فخر کی بات ہے کہ عالم سیّد نے ہماری دعوت کی ہے۔ دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلی فون کے ذریعے سے پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئیں کیوں کہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کریں گے۔ مرحوم نے فرمایا کہ آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے اُن مسلمانوں سے تعارف پیدا کرنے کے لئے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والوں کے مولوی صاحب نے (جو غالباً پنجابی تھے) کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتایئے کہ آپ کے پاس گوشت کہاں سے آیا ہے۔ مرحوم نے پوچھا کہ اس سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ مولوی صاحب نے کہا لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا۔ سب حرام ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کروں گا کبھی گوشت نہ کھاؤں گا۔ مرحوم نے کسی قدر تلخ لہجے میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دینِ اسلام سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ایک مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو اس قسم کے فاسد خیالات وشبہات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا آپ کو لاتجسسوا کا قول یاد نہیں ہے؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ جب غیر قوموں کے ساتھ

معاہدہ کرتے تھے تو منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مُسلمان وہاں وارد ہو اس کی تین دن تک دعوت کریں۔ کیا ان مسلمان مسافروں کے لیے مسلمان ذبح کرتے تھے یا مُسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی شے کے حرام ہونے کا علم نہ ہو اُسے حلال سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ یہ گفتگو مرحوم نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجے میں کی تھی اور سوائے ہندوستانیوں کے دوسرے اُسے سمجھ نہیں سکتے تھے اس لئے باقی لوگ حیرت سے مرحوم کا منہ تک رہے تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پُوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مرحوم نے سارا قصّہ دُہرایا اور کہا کہ یہ ہندوستان کے مُسلمانوں کا نمونہ ہے اس سے آپ ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرلیجئے۔ یہاں یورپینوں نے اوّل ہی سے میرا دم ناک میں کر رکھا ہے، کوئی پُوچھتا ہے "تمھارے مذہب میں پردہ کیوں ہے؟ کوئی کہتا ہے" تمھارے پیغمبر نے تعدد زوجات کی اجازت کیوں دی ہے؟ کوئی سوال کرتا ہے" تمھارے نبی نے عورتوں کے مارنے کا کیوں حکم دیا ہے؟" ان اعتراضات اور سوالات کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آگئے ہیں اور پھر جب یہ مولوی صاحب اور ان کے ہم خیال یہاں کی سوسائٹی میں رہ کر اس قسم کی رکیک باتیں کرتے ہیں تو مُسلمانوں کے متعلق غیر قوموں کے خیالات کیا ہوں گے۔ ایسے شخص کے زہریلے خیالات کا اثر تمام قوم اور ملک پر پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا کہ اگر واقعی ہندوستان کے مُسلمانوں کی یہ حالت ہے تو نہایت قابلِ افسوس ہے۔ جب اہلِ فوج کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے مولوی صاحب نے سیّد صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انھیں رنج پہنچایا ہے تو ان سب نے بالاتفاق مولوی صاحب سے یہ کہا کہ وہ سیّد صاحب کے قدموں پر گریں اور معافی مانگیں ورنہ ہم

اپنی جماعت سے خارج کردیں گے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اُٹھ کر معافی مانگی اور مرحوم نے خندہ پیشانی سے معاف کردیا اور جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کو گلے لگایا اور اُلٹی معافی مانگی اور سو روپے کا چک اُن کی نذر کیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے ملک اور قوم بدنام ہوتی ہے، آئندہ کبھی کسی سوسائٹی میں ایسی گفتگو نہ فرمایئے گا، ورنہ تمام ہندوستان کے مسلمان غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل ہوجائیں گے۔

مرحوم ہندوستان کے مروّجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو وہ اچھّی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی تھے۔

پارسی قوم کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہوجائے گی کیوں کہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جب کہ وہ تمدّنِ ہند کا ترجمہ کر رہے تھے اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سُنانا شروع کیا جس میں ڈراوڑی قوم کا (جو ہندوستان کی ایک قدیم قوم ہے) ذکر تھا۔ جب مرحوم پڑھنا ختم کرچکے تو اُس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے کے لئے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔

مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں مرحوم سے ایک کتاب بغرض نقل مستعار طلب کی، کتاب تھی نادر مرحوم کو دینے میں تامّل تھا مگر مروّت کے مارے صاف صاف انکار بھی

نہ کر سکتے تھے۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سور کے چمڑے کی ہے مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

ایک بار خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا، مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہو میں تو وہابی ہوں یہ کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

مرحوم بہ زمانۂ طالبِ علمی نیز بعد ازاں پنشن لینے کے بعد اِنگلستان میں کئی سال مقیم رہے اور انھیں اعلا سوسائٹی میں جانے اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر باوجود اس کے وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے آداب و تکلّفات کو مہمل سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حُبِّ جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اُسے صرف رُپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسرے بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھّا نہیں سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر زمانے میں مرحوم کو بعض وجوہ سے حیدرآباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا۔ اس وقت انھیں اس کا بہت رنج تھا۔ کیونکہ یہاں ان کے مکانات تھے، کتب خانہ تھا، بیوی بچّے سب یہیں تھے اور دو بیٹوں کی ملازمت کا سلسلہ بھی یہیں ہو گیا تھا، دوسرے عمر کا بہترین حصہ یہیں کٹا تھا اور دُنیا کے نشیب و فراز اور ادبار و اقبال کے تماشے یہیں دیکھے تھے۔ لہٰذا اس کی محبّت وطن کی محبّت سے کم نہ تھی۔ لیکن جب یہاں سے جا کر اُنھوں نے ہردوئی میں قیام کیا (جہاں اُنھوں نے ایک بڑا مکان اپنے

رہنے کے لئے خرید لیا تھا) اور پھر وہاں سے مدرستہ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اس وقت آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ اس سے پہلے عمرِ عزیز بے کار بکھیڑوں اور تفریح میں گزری، زندگی کا لطف اب آئے گا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یونی ورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا جس میں انھوں نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونی ورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انھیں کے تفویض ہوئی جس کے لئے وہ خاص طور پر موزوں تھے۔ اس میں انھوں نے بڑی محنت کی اور قابلِ قدر کام کیا۔ آخر وہ وقت جو اگرچہ معین نہیں ہے مگر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا آگیا اور بے وقت اجل سر پر آن پہنچی اور دفعتہً ہرزوی میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے بتاریخ ۳ رمئی ۱۹۱۱ء انتقال ہو گیا۔ اور قوم کا برگزیدہ فرد اُٹھ گیا۔

مرحوم علاوہ عالم و فاضل ہونے کے متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم پر حُبِّ دولت و جاہ غالب تھی لیکن جب روپیہ اُن کے پاس آتا تو اس کے دینے میں بھی وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پُرزے ہوتے یا اشاعتِ شہرت میں مدد دیتے تھے۔ مرحوم علما اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ اُن کی دُنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنا کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں اُن سے بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے اور اس لئے اکثر ان کے ہاں علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے ان کی مہمان نوازی دیکھ کر عربوں

کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ملک کے سیاح اور علما کے لئے اُن کا عالی شان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ حق میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب جائیے اُن کے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی، امریکن، ترکی یا مصری سیاح یا عالم نظر آتا تھا۔ دوسروں کی بھلائی اور مقصد برآری کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصّب اور روشن خیال مُسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دست گیری کرنا فرض ہے۔ چنانچہ ایک زمانے میں محکمۂ تعمیرات و معدنیات و ریلوے میں سب کے سب یورپین، یوریشین اور دیسی عیسائی تھے۔ مسلمان اِکّا دُکّا نظر آتے تھے، لیکن مرحوم کا تقرّر اس عہدے پر ہوا تو مُسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔

مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبّت تھی۔ چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے وظیفہ لے کر انگلستان گئے تو وہ بھی اُن کے شریکِ سفر تھیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی، مرحوم کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ اُلٹا میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزّت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔

مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِّ جاہ میں ایسی باتیں

کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔ خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ اُن میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ مرحوم اگر اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو بہت بڑے آدمی ہوتے، لیکن افسوس کہ حیدر آباد کی گوناگوں دل فریبیوں اور مجبوریوں نے اُن کے وقتِ عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصّہ غصب کر لیا اور جاہ طلبی کے بکھیڑوں نے وہ اُلجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہ ہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جس کے وہ ہر طرح موزوں اور اہل تھے۔ انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ رات دن سرگرداں و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وہ کوششیں جن کے لئے اُس نے اپنی جان تک کھپا دی پانی کے بُلبُلے سے زیادہ ناپائدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں۔ اور کچھ انھیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور جو شاید ضمنی طور پر کئے گئے تھے۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ کمال کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلقِ خدا کو ان سے فائدہ پہنچے۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا اور قدر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دُنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو، جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ مرحوم

نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں بہت سے کام کئے لیکن اکثر ایسے ہیں جیسے
ہوا کا جھونکا کہ آیا اور گیا۔ لیکن یادگار دُنیا میں وہی کام رہیں گے جن کا اثر
دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا اور یہ ان کی بعض تحریریں ہیں
جو اُن کے قلم سے نکلیں ملک میں پھیلیں۔ اور سورج کی روشنی کی طرح ایک
سرے سے دوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی
اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قدر دانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

خواجہ غلام الثقلین مرحوم

۱۹۱۵ء

ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے لئے ہر شعبے میں انسانوں کی تلاش ہے، جبکہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے۔

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں جو محض نام و نمود کے لئے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزّت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائدار ہوتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔

وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مطالعے اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے، اور تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یونین کلب میں اُن کی تقریروں کی آتش فشانی اور اخوان الصفا میں اُن کے مضامین کی

فصاحت بیانی مشہور تھی وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اس لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے، مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔ خود سر سیّد مرحوم انھیں محض اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مگر اختلاف کرنے میں وہ اُن سے بھی نہ چوکتے تھے، حالانکہ ان کے سامنے بڑوں بڑوں کے پر جلتے تھے۔

علی گڑھ کالج میں اُن سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسے وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا اَن تھک ہو۔ وہ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے اور پالٹکس اور خصوصاً انگلستان کے سیاسیات سے انھیں ابتدا سے بے انتہا دلچسپی تھی اور جس قدر انھیں اس سے واقفیت تھی، ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔ لیکن مادرِ کالج کا برتاؤ اُن کے ساتھ ہمیشہ ظالمانہ رہا۔ کئی بار ان کا نام پیش ہوا مگر وہ کبھی کالج کے ٹرسٹی[1] منتخب نہ ہوئے۔ اور حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اُن کے مقابلے میں ایسے لوگوں کو ترجیح دی گئی جن کا نام لکھنا بھی ہم اس صفحۂ کاغذ پر گوارا نہیں کر سکتے۔ کالج کے کارنامے پر یہ بڑا دھبّا رہے گا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ کبھی نچلے نہ بیٹھے۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے علاوہ بے شمار مضامین کے کئی رسالے اُن کی یادگار ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت ان کا نصب العین تھا اور اسی چونپ نے اُن سے ریاست حیدرآباد دکن کی ایک معزز خدمت چھڑا کر میدانِ وکالت میں لا کھڑا کیا۔ یہاں اُن کی طبیعت کے اصل جوہر کھلے۔ وکالت کا پیشہ ایسا ظالم پیشہ ہے کہ وہ انسان کو کسی دوسرے

[1] ممبر کونسل ہو جانے کے بعد خواجہ صاحب ٹرسٹی بھی بنا لیے گئے تھے۔

کام کا نہیں رکھتا، لیکن وہ باوجود اس پیشے کی مصروفیتوں کے ہمیشہ قومی کاموں میں پیش پیش رہے۔

کوئی پندرہ سال ہوتے ہیں کہ خواجہ صاحب ہی کی تحریک سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے۔ اصلاحِ تمدّن کا صیغہ اُن کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اپنے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔ کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور نامور لوگ تھے، لیکن جیسا اصلاح تمدّن کا صیغہ چمکا وہ بات کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے پرچے عصرِ جدید کے ذریعے سے اصلاحِ تمدّن پر بڑے بڑے پُرزور مضامین خود لکھے اور دوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لکچر دیئے اور تقریریں کیں اور مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت کی ایک ہل چل پیدا کر دی۔ لیکن افسوس کہ کچھ تو اُن کے تلوّن کی وجہ سے اور زیادہ تر کانفرنس کی بے اعتنائی اور مالی دقتوں کی وجہ سے انھیں اس صیغہ کو خیرباد کہنا پڑا، اور اس کے بعد سے آج تک کسی کی ہمّت نہیں ہوئی کہ وہ اس امانت کا بار اُٹھائے۔ اور اگرچہ صیغہ مر گیا لیکن اس کا اثر اور اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

خواجہ صاحب طبعاً ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ ان پر بعض اوقات ناکامی کا بہت بُرا اثر پڑتا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک ناکامی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور جلد پریشان ہو جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جس کام کو لیتے تھے اس میں ہمہ تن منہمک ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو جوش اور آگ ان میں ہے وہی دوسروں

میں بھی ہو۔ لیکن یہ کہاں ہوتا ہی، خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھّروں سے سر پھوڑنا ہی۔ نتیجہ ظاہر ہی کہ مایوسی ہوتی ہی اور یہ مایوسی انھیں پریشان کردیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور کامیابیوں نے انھیں ایک بار ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ وہ مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت کرتے ہوئے ایران پہنچے، وہاں بھی وہ خاموش نہ رہے اور انھوں نے ملکی اصلاح کا ڈول ڈالا؛ وہاں کے مشہور لوگوں سے ملے، تقریریں کیں، اصلاحِ ملک پر بحثیں کیں، لیکن اس وقت ایران کی حالت ہندوستان سے بھی بدتر تھی لہذا انھیں مجبوراً لوٹنا پڑا۔ اور اگرچہ وہ مایوس ہوگئے تھے مگر زیادہ مضبوط ہوکر آئے اور کچھ ہی عرصے کے بعد اُنھوں نے دگنی اور چوگنی قوت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔

ایران جانے سے قبل مرحوم نے صوبۂ متحدہ کی کونسل کی ممبری کے لیے بڑے شد و مد سے کوشش کی تھی، لیکن اسی سختی کے ساتھ انھیں ناکامیابی بھی ہوئی۔ اس کا اُن پر بڑا اثر ہوا۔ منجملہ دیگر وجوہ کے ایک یہ وجہ بھی ہندوستان سے کچھ دنوں کے لئے ہجرت کرنے کی ہوئی۔ لیکن دوبارہ جب ان کا انتخاب ہوا تو انھوں نے اس قدر شوق، مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ اس اہم کام کو انجام دیا اور اس نیابت کا حق اس خوبی سے ادا کیا کہ اس سے ثابت ہوگیا کہ صوبۂ متحدہ کے مسلمانوں میں اگر کوئی شخص کونسل کی ممبری کا حق رکھتا ہی وہ خواجہ صاحب ہی تھے۔ غالباً اُس وقت اُن کے مخالفوں کو کچھ کم ندامت نہ ہوئی ہوگی۔ اُس زمانے کا ان کا بڑا کارنامہ مسئلہ سود ہی۔ اس مسئلے پر انھوں نے اس قدر جان توڑ کے محنت کی تھی کہ ان کی صحت کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس میں پوری کامیابی نہ ہوئی لیکن ایک بعد یہ مسئلہ پاس ہوکے رہے گا اور اس کامیابی کا سہرا خواجہ صاحب مرحوم ہی کے سر ہوگا۔

اگرچہ خواجہ صاحب عقائد کی رو سے پکّے شیعہ تھے۔ لیکن اُن میں تعصّب نہ تھا۔ وہ مسلمانوں کی خدمت میں سُنّی شیعہ کی مطلق تمیز نہ کرتے تھے اور سب کی خدمت کے لئے یکساں حاضر تھے اور یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ شیعہ کانفرنس کے بنا و قیام میں شریک غالب تھے، مگر تھوڑے ہی عرصے بعد انھیں اس سے کنارہ کشی کرنی پڑی۔

آخر آخر میں اُن کی طبیعت میں ایک خاص اعتدال پیدا ہو گیا تھا اور ان میں وہ اضطراب اور پریشانی اور وہ ضد نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ یہ اعتدال کچھ تو دُنیا کے نشیب و فراز اور تجربوں نے پیدا کر دیا تھا اور کچھ کونسل کی ممبری نے۔ مگر پھر بھی وہ شمالی ہند کی زہریلی آب و ہوا سے نہ بچ سکے۔ اُن کی ساری کوشش اور خدمت مسلمانوں کی قوم کے لئے تھی اور وہ بھی شاید شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے لیکن تاہم اُن کی نظر وسیع تھی اور وہ اُن تنگ دل مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرح نہیں تھے جن کے کاموں کی بُنیاد نفسانیت پر ہوتی ہے اور جنھیں بلا لحاظ دوسرے کے ضرر کے اپنی ہی کام یابی کی دُھن ہوتی ہے یا جو دوسرے کے ضرر پر اپنی کام یابی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اس سے بَری تھے۔ شاید یہ زمانہ انھیں گروہ بندیوں اور جتھوں کا ہے۔ شاید یہ پہلی منزل ہے، اور آج کی محدود کوششیں کل ہمیں اس مقام پر پہنچا دیں جہاں جتھوں اور گروہوں کی ناہمواریاں مٹ کر مساوات پیدا کر دیں گی۔

مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

خواجہ صاحب کا ذوق علمی تھا۔ اُن کا مطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا۔ لیکن چونکہ پہلی سی فرصت نہ تھی، اس لیے مطالعہ کی

وہ شان باقی نہ رہی تھی مگر وہ ہمیشہ علمی مباحثوں میں بڑی دل چسپی کا اظہار کرتے تھے۔ قلم اُن کا آخر دم تک نہ رکا اور وہ برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ عصرِ جدید کو دوبارہ زندہ کیا۔ مگر افسوس کہ اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ان کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ آخر زمانے میں اُن پر مذہب کا رنگ بہت غالب آ گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اُن کے مطالعے نے زمانے کا ساتھ نہ دیا ہو، یا صحت کی خرابی کچھ مساعد ہوئی ہو، یا یہ کہ مذہب کے غوامض اور اسرار کی طرف اُنھوں نے خاص طور سے توجہ کی ہو۔ خیر کوئی وجہ ہو۔ اُن پر مذہب کا رنگ گہرا چڑھ گیا تھا اور اُن کے آخر زمانے کی تقریروں اور تحریروں کے فقرے فقرے سے مذہب کی بو آتی ہے۔

وہ بے تعصب مسلمان مگر پکے تشیعی تھے۔ اور لکھنؤ کے قیام میں تشیع کا میلان کسی قدر شدید ہو گیا تھا۔ جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا، میں ایک روز حسبِ معمول اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھتے ہی فرمانے لگے آیئے آج آپ کے دوست یعنی (خواجہ غلام الثقلین) کا ہدایت نامہ وصول ہوا ہے۔ میں نے کہا خیر ہے کیا لکھا ہے۔ فرمانے لگے لکھا کیا ہے تلقین فرمائی ہے کہ تم بہت بڈھے ہو گئے ہو، گور کے کنارے پہنچ گئے ہو۔ اب تو راہِ راست پر آجاؤ۔ مطلب یہ تھا کہ اپنے عقائد سے توبہ کرو اور مذہبِ حق پر ایمان لے آؤ۔ خواجہ صاحب مولانا حالی کے نواسے تھے۔

مرحوم کی زندگی پاک اور اس کا دامن بے داغ تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے آخر دم تک کام کرتا رہا۔ اُس نے خلوص اور جوش کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی۔ صداقت اور جوش کے ساتھ اعتدالِ مزاج نے اُسے اِصلاح کا

زیادہ اہل بنا دیا تھا۔ اور اب اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہوگئی تھیں۔ لیکن ایسے وقت میں جب کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اُس نے ہم کو داغ مفارقت دیا۔ اُسے بے وقت موت آئی۔ یہ اس کے کام کا زمانہ تھا۔ قوم کو اس سے کچھ کام لینا تھا لیکن اجل کے زبردست ہاتھ نے ساری اُمیدیں خاک میں ملا دیں۔

بہرحال مرحوم کی زندگی عبرت آموز ہے اور جو لوگ قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُنھیں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

یہاں یہ بات بھی کچھ کم فکر و تشویش کی نہیں کہ ان لوگوں میں سے جو خاص اس عصرِ جدید کا نتیجہ ہیں، جس جس نے قوم کی خدمت کی وہ جوان ہی چل بسا۔ مسٹر تلانگ، مسٹر گوکھلے، ڈاکٹر ستیش چندر، پنڈت بشن نرائن در، خواجہ غلام الثقلین اور دوسرے بیسیوں نوجوان شباب میں نذرِ اجل ہو گئے۔ کیا یہ مسئلہ قابلِ غور نہیں ہے؟

حکیم اِمتیاز الدّین

۱۹۲۷ء

عزیزی[1] ہمارا بے مثل دوست حکیم، مرگیا۔ افسوس، صد افسوس، وہ اپنے فن اور رنگ میں ایک تھا۔ اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لا ابالی تھا مگر دوستی کا سچّا اور دھن کا پکّا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا مگر خیال میں اُس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالمِ مثال بھی اُس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبّت تھی تو انتہا درجے کی۔ عداوت تھی تو انتہا درجے کی میانہ روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔ قدامت اور جدّت عجب طرح سے اس کے مزاج میں سموئی ہوئی تھیں۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پُرانے لوگ اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدّت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اس کے آگے ماند تھے۔

وہ اپنے خیال میں آزاد، مطلق العنان اور اپنی طبیعت کا بادشاہ تھا۔ وہ بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اس کی ساری کائنات عالمِ خیال میں تھی جو کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوئی۔ اس کا تخیّل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلا درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اگرچہ وہ شاعر نہ تھا لیکن اچھے اچھے شاعر اس کے

---

[1] مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی۔

سامنے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ اس کا ہر فعل اور اس کی ہر بات شعر تھی۔ ایک معمولی مصرعہ، قوال کا ایک بول اسے آپے سے باہر کر دیتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ آپے سے باہر رہتا تھا۔

جس قدر جلد وہ بگڑ جاتا تھا، اُسی قدر جلد خوش بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کی چال ڈھال، اس کی ہیئت، اس کی طرزِ معاشرت، اس کا برتاؤ سب نرالے تھے اور سب میں لا ابالی پن پایا جاتا تھا۔ وہ سوائے اپنے خیال کے کسی چیز کا پابند نہ تھا مگر پرلے درجے کا خود دار بھی تھا۔ وہ اپنے فن میں باکمال تھا، اس کی حذاقت مسلّم تھی۔ وہ طبیب ہی نہ تھا حکیم بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ وقت پر وہ کام کر جاتا تھا جو بڑے بڑے حاذق طبیب اور ڈاکٹر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غریبوں کا غمخوار اور دوستوں کا ہمدرد تھا۔ افسوس کہ حیدر آباد ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا جس کی نظیر اب نہیں ہے۔ لوگ اسے بہت یاد کریں گے۔ احباب کے جلسے اس کے بغیر سونے ہوں گے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھا۔ اور سب سے زیادہ اس کے غریب دوست اس کا ماتم کریں گے۔

مولانا وحید الدین "سلیم" پانی پتی

سنہ ۱۹۲۹ء

مولانا سلیم کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ جامعۂ عثمانیہ ہی کو اُن کا جانشین ملنا مشکل نہیں بلکہ اب اُن جیسا ادیب سارے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے، اُردو زبان پر ان کی وسیع نظر تھی، خاص کر نئے الفاظ کے بنانے میں انھیں بہت بڑا ملکہ تھا۔ ان کی کتاب "وضع اصطلاحاتِ علمیہ" ایک حد تک ان کی وسعت نظری اور تبحر کی شاہد ہے۔ وہ اعلا درجے کے نثّار تھے، اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ شاعری ان کی زورِ طبیعت کا نتیجہ تھی، بعینہٖ جیسی مولوی نذیر احمد مرحوم کی شاعری، لیکن "سلیم" مرحوم اُن سے سبقت لے گئے تھے۔ ان کے قلم اور آواز میں بڑا زور تھا۔ ان کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں بھی مولوی نذیر احمد سے ملتی جلتی تھیں۔

مرحوم نے عمر بھر یا تو طالب علمی کی یا علم و ادب کی خدمت۔ علاوہ ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے وہ اعلا درجے کے اخبار نویس بھی تھے۔ مسلم گزٹ کے پرچے جن صاحبوں نے بہ غور پڑھے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین مسائلِ وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو

جب انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کی کایا پلٹ دی۔ یا تو وہ ایک مردہ اخبار تھا یا دفعتہً زندہ ہو گیا۔ اُن کا رسالہ معارف، اُردو کے اُن چند رسالوں میں ہے جنھوں نے ملک میں علمی ذوق پیدا کر کے زبان کی حقیقی خدمت کی ہے۔ وہ کسی رنگ میں ہوں، تھے وہ ادیب ہی، سیاسیات کا انھیں کوئی ذوق نہ تھا، البتہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔

مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا، جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے، جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اُن کی طبیعت سے واقف نہ تھے اُن کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا۔ اسی طرح باوجود زبردست عالم و فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔

جس طرح انھیں طالب علمی میں مولانا فیض الحسن جیسے بے مثل ادیب اُستاد ملے، اسی طرح اس کے بعد سر سید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصلحت وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بدنصیبی سے اُنھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے اور کچھ صحبت اور تجربہ۔ ان میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

اُن کے دوست بہت کم تھے، شاید دو چار ہی ہوں، مگر جن کے دوست تھے، دل سے تھے لیکن ساتھ ہی بہت مرنج و مرنجان تھے، کسی کو حتی المقدور ناراض نہیں ہونے دیتے تھے۔ خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ بہت بے تکلّف تھے اور خوب باتیں کرتے تھے اور خوب ہنستے اور ہنساتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جامعۂ عثمانیہ کو مولانا سے بہتر پروفیسر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونی ورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہی وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ اُنھوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وہ انھیں کا کام تھا، اور یہ بہت بڑا احسان ہی۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہی اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہی۔

مرحوم کی طالب علمی کا زمانہ بہت عسرت میں گزرا اور آخری زمانہ جو فارغ البالی کا تھا وہ بھی افسوس ہی کہ عسرت ہی میں بسر ہوا۔ انھیں اپنی فارغ البالی سے کچھ لہنا نہ تھا۔ گو ان کی عمر زیادہ تھی، شاید اسٹھ کے لگ بھگ لیکن اُن کے قوی ایسے اچھے تھے کہ بہت دنوں اور جی سکتے تھے مگر اُنھوں نے کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول اِنتظام کیا۔ وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے۔ یہی اُن کی بیماری اور بالآخر اُن کی موت کا باعث ہوا۔

انجمنِ ترقیٔ اُردو اور خاص کر رسالۂ اُردو سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اُن کے بعض بہترین مضامین "اُردو" میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا شرر مرحوم کے انتقال پر جب انجمن نے مرحوم کے نام سے "اُردو کے بہترین مضامین کے لیے مستقل طور پر سالانہ تین انعامات کی تجویز کی تو سب سے پہلا انعام جو دو سو روپے کا تھا، مولانا نے خود ہر سال دینا منظور فرمایا۔ وہ صرف ایک سال

دینے پائے تھے کہ دوسرے سال خود اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے مہربان اور شفیق دوست تھے اور مجھے اُن کی موت کا بے حد رنج ہے، میں اُن کی موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی اور ادبی کام میں ہم اُن کا نام سب سے پہلے شریک کرتے تھے، اب جو وہ نہیں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدّت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو اُستاد تھے۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے اُس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر جب انگریزی سے اُردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ وہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں، جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔

ہمیں اُن کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں وقف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم ہونا بہت دشوار۔ اُنھوں نے محض اپنی محنت اور قابلیت سے یہ درجہ پایا۔ ایک غریب لڑکا جس کے پاس پڑھنے کو کتابیں اور بھر پیٹ کھانے کو روٹی نہ تھی، وہ اپنی ہمّت اور شوق اور اپنے علم و فضل کے زور سے ایسا ہوا کہ آج اس کی موت پر ایک بڑے طبقے کو حقیقی رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں۔ جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

گُدڑی کا لال - نور خاں

سنہ ۱۹۳۰ء

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اِس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ اِنسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے

نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اوّل رسالے میں سپاہی سے بھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہو سکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتے تھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ کنٹنجنٹ والے عزّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ قید بھی اُٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہ رہا۔ پہلے زمانے میں سپاہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا، اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان

اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے، ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسرالملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں۔ کننجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے اور بعض اور ذرائع سے حیدرآباد ریاست میں آکر ملازم ہوگئے۔ ان میں بہت سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اوّل رسالے کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے۔ یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے ڈرل سکھاتے تھے۔ اِس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہسوار تھے۔ گھوڑے کو خوب پہچانتے تھے، بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹّھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے، اُنھوں نے درست کیے۔ گھوڑے کے سدھانے اور پھیرنے میں اُنھیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے گھڑدوڑوں میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ اُن کے افسر اُن کی مستعدی، خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے لیکن کھرے پن سے وہ اکثر اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انھیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی، خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے۔ اُنھوں نے فوراً رپورٹ کردی۔ لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے اور آگے نہ بڑھے، مگر خاں صاحب نے ایک نہ سُنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا

اور اُس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے - ہر چند اُس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اُسے معافی مانگنی پڑی - ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے -

اچھے بُرے ہر قوم میں ہوتے ہیں - شریف افسر خاں صاحب کی سچّائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور اُن کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے - مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا، اُنھیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ اُن کے نقصان کے درپے رہتے تھے - ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو تو جوہرِ شرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اُسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں - تاہم اُن کے بعض انگریز افسر اُن پر بہت مہربان تھے - خاص کر کرنل فرن مین اُن پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو - جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفا دیا تو اپنا تمام مال واسباب اور سامان جو ہزارہا رُپے کا تھا خاں صاحب کے سپرد کر گئے - یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا - اُس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اُس نے کرنل موصوف کو خط لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے - اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اُسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے - اب بھی اگر آپ لکھیں تو اس کا انتظام ہو سکتا ہے - کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں - اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے - ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی ،

چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے، اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔ خاں صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا، آپ کرنل صاحب کو لکھئے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خان نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور میں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرّر سے اس سامان کی مکمّل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خوش خرید پر کچھ نیلام کے ذریعے بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا کوئی دوسرا افسر، جب ملازمت سے قطع تعلّق کرکے جانے لگا تو اُس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد خاں صاحب کو بطور انعام یا شکرانے کے دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے اِنکار کیا، کرنل اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر اُنھوں نے سوائے ایک بندوق کے دوسری چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے افسر، کمانڈنگ افسر تھے، ان پر بہت مہربان تھے۔ رسالے کے شریف انگریز اُن سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو بہت نقصان پہنچائیں گے۔ وہ اُن کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے، خوشامد سے انھیں چڑ تھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا، گھوڑے سے اُتر کر اُس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ اُنھوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں اس نے ایسا جواب کا ہے کو سُنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا، آخر باگ درخت کی ایک شاخ

سے اٹکا کر اندر چلا گیا - اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق تھا کہ باگ شاخ میں سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا - اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد - بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا - اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اُس انگریز کو کیا جواب دیا، لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں دیکھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں - وہ بیمار بن گئے اور ہسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی بُرائیاں ہی اُس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض وقت اُس کی خوبیاں بھی اُسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ وہ مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انھیں ایک اچھّا عہدہ دلا دیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اب اپنے وطن دولت آباد ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھّا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمھیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائے گی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے - آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صوبۂ اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے۔ وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی۔ کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور اندازے سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالاحصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سگرٹ پینا چاہا۔ دیا سلائی نکال کر سگرٹ سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلام کرکے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدے داروں کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، لہو کے سے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت کچھ لے دے کی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہئے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی کے لیے مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آگیا، اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آگئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی، اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں بھی آپہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اُٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے۔ کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دُعا دیتا ہوں اب آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آگئی۔ مسٹر واکر نے کہا یہ تو بہت اچھا کام ہے۔ دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہوئے ہیں ایک ایک آنے کو بھی ایک ایک انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائے گی۔ خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کم بخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے۔ تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل کر گر جاتے ہیں، کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرند کھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔ مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اور چند ہی باتوں میں آدمی کو ایسا پرکھ لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔ کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں، فوراً ہی اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔ نواب برزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے۔ مقبرے کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الونس مقرر کرا دیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔ کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے، میں اُسے

خریدلوں گا مگر پہلے نور خاں کو دکھالوں ۔ وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اُس گھوڑے کو دیکھ آؤ کوئی عیب تو نہیں ۔ خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا ۔ گھوڑے میں کوئی عیب ہے تو میں چھپاؤں گا نہیں اور صوبے دار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو کل جاکے ضرور گھوڑا دیکھ لو ۔ خاں صاحب گئے ۔ گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے ۔ اُنھوں نے صاف صاف آکے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے انکار کر دیا ۔ صوبے دار صاحب آگ بگولا ہو گئے ۔ دوسرے روز مقبرے میں آئے باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اُٹھتے ۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انھوں نے اس کی تلافی کر دی ۔ یہ سُن کر صوبے دار صاحب اور بھی جھنجھلائے ۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدر آباد چلے گئے ۔ اُن کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا ۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظمِ تعلیمات ہو گئے اور میں اُن کی عنایت سے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا ۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرس کر دیا تھا ، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرّر کر دیا ، وہ مدرسی اور محرّری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرّروں سے زیادہ کار آمد تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الونس بھی جاری ہو گیا ۔

اعلیٰحضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب و ہوا کو بہت پسند فرمایا اور عظیم الشان باغ لگانے کا حکم دیا ۔

یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر کوئی یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی بات کی اور معاملے کی اُن کی سرشت میں تھی۔ خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اس میں انھیں نقصان بھی اُٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو، رات ہو ہر وقت کام کرنے کے لیے تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی خوشی کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکّے اور بڑے وضع دار تھے۔ چونکہ ادنا اعلا سب ان کی عزّت کرتے تھے اس لیے اُن سے غریب دوستوں کے بہت سے کام نکلتے تھے۔ اُن کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھیر جاتے تھے ان کی بھی دعوت کر دیتے تھے۔ بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیّاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر اُن کی یہ مہمان نوازی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اُن کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے تھے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح

سے اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے ۔ مجھ سے انھیں خاص اُنس تھا میں کوئی چیز دیتا تو کبھی انکار نہ کرتے بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے ۔ مٹھاس کے بیحد شائق تھے ۔ اُن کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں ، مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں" انھیں مٹھاس کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی ۔ اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے ۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے ، قسم قسم کے تکلّف کے کھانے تھے ۔ خاں صاحب چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا ۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کرکے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا ہے کہنے لگے کہ "حضرت یہ میٹھا ہے" مگر اُنھوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے ۔ جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا ۔ ان صاحب نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے ، اُنھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا ۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے تو وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے ۔

خاں صاحب بہت زندہ دل تھے ، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی ۔ وہ بچّوں میں بچّے ، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے ۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے ۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا ۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی ۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اُترتے ہی اپنا رُپیہ پیسہ سب اُن کے حوالے کر دیتے اور سب خرچ انھیں کے ہاتھ سے ہوتا تھا ۔ جانے سے پہلے ایک روز قبل وہ حساب لے کے بیٹھے ، بعض وقت

جب بدہ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے تھے، ہر چند ڈاکٹر صاحب
کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا باقی جو بچا وہ دے دیا یا زیادہ
خرچ ہوا ہو تو لے لیا، مگر وہ کہاں مانتے تھے جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انھیں
اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجے صاحب یہ آپ کا حساب ہے اتنا خرچ ہوا
اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے ہیں
یہ ہمیں دلوایئے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انھیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب
لے کے بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے وہ بھیجے جاتے ہیں
یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے وہ بھیج دیجئے گا۔ ڈاکٹر صاحب ان
باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے مگر وہ اپنی وضع نہ چھوڑتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے، وہ مہر و وفا
کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور
وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا
اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ اُن کی زندگی
بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے
وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں
کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی
لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

محسن الملک

۱۹۳۴ء

قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں، وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی اُن کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔ خطاب یا نام اٹکل سے رکھ دیے جاتے ہیں، مسمیٰ کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، عطائے خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا لیکن محسن الملک کا خطاب ان کے لیے بہت ہی موزوں نکلا۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو کہیں کا ہو ان سے چھوا نہیں اور کُندن ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا تھا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دُشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ اور یہ میں ذاتی علم سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اُن کے زیرِ بارِ منت تھے۔ سیاسی مصلحتیں بعض اوقات اہلِ حکومت کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اُن افراد کو جو اُن کی یا حکومت کی راہ میں حائل ہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیں۔ مرحوم کو بھی کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا لیکن اُنھوں نے اس ناگوار اور دل شکن کام کو اس خوبی اور سلیقے سے کیا کہ مخالف ہونے پر بھی محسن الملک کو دعائیں دیتے گئے اور جب تک زندہ رہے اُن کے شکر گذار رہے۔

وہ جوہرِ قابل تھے مگر موقع کی تاک میں تھے۔ حیدرآباد میں اُن کی سیاست دانی،

تدبر، انتظامی قابلیت کے جوہر کھلے۔ ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ وہاں سازشوں، ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوش مند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ اکثر ذاتی اغراض کے لیے یہ سب جتن کرتے ہیں، مگر خاص خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ریاست کی بہبودی کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دے دیتے ہیں۔ ان چند مخصوص لوگوں میں نواب محسن الملک کا بھی شمار ہے۔ اس اکھاڑے میں اترنا اور بلوہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے اور یہ کوئی محسن الملک سے سیکھتا انھیں بھی جھگڑوں میں پھنسنا پڑا، بعض اوقات کرہاً اور بعض اوقات طوعاً، لیکن انھوں نے کبھی ریاست کے مفاد کو ذاتی اغراض پر قربان نہیں کیا۔ وہ کوئلوں کی اس کوٹھری میں گئے مگر ہمیشہ بے داغ نکل آئے۔ لیکن باوجود اس قدر مدبر، ہوش مند اور شاطر ہونے کے آخر وہ خود بھی اسی کا شکار ہوئے۔

ریاستوں میں دوگونہ مصیبت ہوتی ہے۔ ایک اندرونی، دوسری بیرونی۔ پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اب رنگ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ خود مختار حکومتوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بہت گنجائش ہوتی ہے ہر شخص کی (خواہ وہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح "سرکار" کو خوش کر لیا جائے جس سے "پیا" خوش آسی کا راج۔ اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کش مکش میں کذب و افترا، بہتان، مخبری، غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دور دور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں

ظہور پذیر ہوتا ہے اور ایسے حیرت انگیز نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ بڑی طویل داستان ہے، اس کی تفصیل کو دفتر درکار ہیں۔ اس کے لیے بعض لوگوں کے دماغ خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں۔ یہاں علمی قابلیت اور فضیلت کام نہیں آتی، یہ کوچہ ہی اور ہے۔ بعض لوگ دیکھنے میں بالکل بدھو معلوم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ایسے ہی ہیں، لیکن بلا کے سازشی ہوتے ہیں اور ان کا دماغ ان معاملات میں ایسا رسا ہوتا ہے کہ اُن کے کارنامے دیکھ کر بڑے بڑے مدبر اور قابل لوگ ششدر رہ جاتے ہیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ چیزیں خوب پھلتی پھولتی تھیں۔

یہ تو ہوئی ایک مصیبت اندرونی۔ اب دوسری مصیبت کا حال سُنئے جو بیرونی ہے۔ والیے ریاست اپنے علاقے کا حاکم با اختیار ہے، سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن اُس کے ساتھ ایک ایسی پخّر لگی ہوئی ہے، جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص ہوتا ہے، نہ صاحبِ اختیار ہے، نہ صاحبِ جاہ و منصب، نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے۔ یہ رزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اِس کنکوے کی "ڈور" صاحب عالی شان بہادر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے مدّعیوں کے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے مدّبروں کی تدبیریں بے سود ثابت ہوتی ہیں" بڑے صاحب" کی نظر پھری تو ایک دُنیا پھر جاتی ہے۔ بعض اوقات" رزیڈنسی" اور" پیلس" دو بڑی رقابت گاہیں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک طرف فارن آفس اور گورنمنٹ اور دوسری طرف ارکانِ ریاست اور مصاحبین حضور، ایک دوسرے سے اُلجھ جاتے ہیں۔ حسد اور رقابت" بر سرِ سٹیج" اور بات کی پچ بیچ میں آپڑتی ہے جس کی

وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور ایسے پیچ پہ پیچ پڑنے شروع ہوتے ہیں کہ اصل معاملہ تو الگ رہ جاتا ہے اور بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات حالت ایسی نازک ہو جاتی ہے کہ حکومت تو رہی ایک طرف، جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس پر پیچ گتھی کو اس طرح سُلجھانا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے، رزیڈنٹ بہادر بھی خوش رہیں، ریاست کے وقار کو بھی زیادہ صدمہ نہ پہنچے اور اصل معاملہ (جو کچھ بھی نہ تھا) اس طرح طے ہو جائے کہ طرفین کو کچھ عذر نہ ہو، ریاست کے انتظام میں سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ یہ کمال نواب محسن الملک کا خاص حصّہ تھا۔ ان کا ذہن ایسا رسا، ان کی طبیعت ایسی حاضر، ان کے اوسان ایسے بجا اور معاملات اور واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سُلجھا دیتے تھے۔ وہ اگر ٹرکی یا کسی اور سلطنت کے فارن منسٹر ہوتے تو یقیناً دُنیا میں بڑا نام پیدا کرتے۔ بڑے بڑے مدبّر ان کا لوہا مان گئے تھے۔

یوں تو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نواب صاحب مرحوم کے احسانات حیدرآباد اور اہلِ حیدرآباد پر بے شمار تھے۔ لیکن ریاست کے نظم و نسق میں چند چیزیں خاص اُن کی یادگار ہیں۔ مثلاً ریاست کا بجٹ نواب صاحب نے مُرتّب کیا اور یہ مصر کے بجٹ کے نمونے پر تھا جو وہاں انگریزی نگرانی کے بعد پہلی بار تیار ہوا تھا۔ بندوبست کا محکمہ بھی انھیں کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اراضی پیمائش کا کام کیا۔ اس کے علاوہ فنانس اور مال گزاری میں بہت سی اصلاحیں کیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ اُن کے سوانح نویس کا کام ہے۔[1]
حیدرآباد میں بڑے بڑے لوگ آئے اور گئے لیکن اب تک کسی کو وہ

---

[1] افسوس ہے کہ مؤلف اس دُشوار راستے کو طے نہ کر سکا۔

عام مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل نہیں ہوئی جو نواب محسن الملک کو ہوئی۔ ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وہ ہر بڑے اور صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں، لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا، سینکڑوں آدمی جن میں امیر غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے، زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا؟

جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا، مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا اس لیے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ ذرا سی بدگمانی پر بھی اُن کے جذبات بھڑک اٹھتے تھے۔ اس وقت شاید ہی کوئی ایسا مسلمان مصنّف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے تھے اور اپنے خیال میں بدمذہب و بدعقیدہ سمجھتے تھے، ان کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا۔ سرسیّد تو خیر ان کے مرشد ہی تھے، ان کے حلقے کے دوسرے رکن بھی مثلاً نواب محسن الملک، حالی، مولوی مشتاق حسین، شبلی، چراغ علی، نذیر احمد وغیرہ خواہ کچھ ہی لکھتے لیکن تان مذہب ہی پر ٹوٹتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا، پہلے وہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے، نیچری ہونے پر لکچر دیے اور مضامین لکھنے لگے۔ لیکن ان سب کا

تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے ہوتا تھا۔ ان کی ایک ہی تصنیف ہے جو خالص مذہبی ہے، ورنہ اس کے سوا ان کی جتنی تحریریں ہیں وہ یا تو تعلیمی ہیں یا معاشرتی یا علمی۔ لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے اسلام یا مسلمانوں سے ہے۔ گو وہ اُردو کے اعلا درجے کے ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریر میں ادبیت کی شان ضرور پائی جاتی ہے۔ روانی، فصاحت، تسلسلِ بیان ان کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی کتابیں پڑھوا کر سُنتے اور ترجمہ کرا کر مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔

تقریر کے وقت منھ سے پھول جھڑتے تھے۔ آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جو ان سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو اُن کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔ ان کی خوش بیانی ایسی تھی کہ اکثر اوقات مخالف بھی مان جاتے تھے۔ دکن میں رہتے رہتے اور بعض امراض کی وجہ سے بھی وہ شدید موسم کی برداشت نہیں کر سکتے تھے، ایسے زمانے میں وہ بمبئی چلے آتے تھے۔ بدرالدین طیب جی، سرسید احمد خاں کے مشن اور علی گڑھ کالج کے بہت مخالف تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے بدرالدین طیب جی کے سامنے ایسی فصیح اور پُر درد تقریر کی کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور تھوڑی سی دیر میں اُن کی دیرینہ مخالفت کو ہم دردی سے بدل دیا اور ایک گراں قدر عطیہ کالج کے لیے اُن سے وصول کر لیا۔ بمبئی میں جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس کے صدر بھی بدرالدین طیب جی ہوئے۔ بڑے بڑے جلسوں میں جب معاملہ بگڑنے لگتا اور یہ اندیشہ پیدا ہو جاتا کہ کہیں جلسہ درہم برہم نہ ہو جائے تو اُس وقت نواب صاحب کی خوش بیانی، فصاحت اور ظرافت جادو کا

کام کرجاتی تھی اور منغض اور مکدّر چہرے بشاش اور شگفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کی باتوں اور تقریروں میں ظرافت کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ باتوں میں ظرافت کبھی کبھی شوخی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔

دوسروں سے کام لینے کا انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح سے ہمّت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی اُن کا حُسن سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے ان کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔

آدمی کے پہچاننے میں اُنھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دُنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصّہ ہے اور شاید دُنیا کی بہت کچھ رونق انھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے۔ مدبّرین اور سیاست دانوں کو طرح طرح کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور قسم قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی ایسا وقت آپڑتا ہے کہ بدمعاشوں سے کام لیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن کمالِ تدبّر اس میں ہے کہ ان سے کام تو لیا جائے لیکن اُنھیں قابو پانے کا موقع نہ دیا جائے۔ نواب صاحب اس فن کے اُستاد تھے۔ وہ بدمعاش سے کام لیتے تھے لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ بدمعاش ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات اُس کی اپنے ہاتھ میں ایسی رکھتے کہ وہ سر نہ اُٹھا سکتا اور اُسے اُن کی اس کم زوری سے فائدہ اُٹھا کر اُن پر قابو پانے کا موقع نہ ملتا۔

اُن کا ذوق نہایت نفیس اور پاکیزہ تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض اُن کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے حیدر آباد

میں نواب صاحب کی کوٹھی (جو اب بھی کوٹھی محسن الملک کہلاتی ہے) دیکھی تھی وہ اس کی داد دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا کیا منشا تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی انھیں دنوں اور انھیں کی بدولت مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملہ میں سرسید کے سب سے بڑے اور اوّل معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔ ان بزرگوں نے ہر چند لباس کی تراش خراش، مکانوں کی سجاوٹ اور بود و باش کے طریقے میں انگریزی تقلید کی۔ لیکن کھانا اُن کا وہی ہندستانی رہا، اسے نہ بدل سکے۔ یہ چٹخارے انگریزی کھانوں میں کہاں؟ نواب صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور بہت نفیس اور عمدہ کھانا کھاتے تھے۔ اُن کے کھانے بہت مُرغّن ہوتے تھے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ایسے کھانے بغیر کسی ورزش وغیرہ کے وہ کیوں کر ہضم کر لیتے تھے۔ یہی حال نواب عماد الملک مرحوم کا تھا۔ اُنھیں بھی کھانے کا بہت شوق تھا۔ یہ لوگ کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے۔ اسی شوق کی بدولت وہ باورچیوں کی بڑی ناز برداری کرتے تھے۔ اُن کا باورچی جہانگیر تھا، یہ بھی اٹاوہ کا تھا۔ پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا وہ ضعیف ہو گیا تو جہانگیر اس کی جگہ آ گیا۔ خوب کھانا پکاتا تھا، اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ مگر بڑا ہی گستاخ اور بد مزاج تھا۔ ایک دن اس نے نہایت گستاخانہ اور نا ملائم کلمات نواب صاحب سے کہے۔ نواب صاحب خفا ہو کر اوپر چلے گئے۔ تیسرے پہر جب وہ نیچے آئے تو اُن کے ایک نیازمند نے عرض کیا: "افسوس کی بات ہے! ایسے کھانے سے تو فاقہ بہتر ہے" فرمانے لگے "ارے میاں تم کیا جانو یہ گالیاں نہ تھیں چٹنی تھی یہ

ایک روز نہ معلوم کیا بات ہوئی وہ خفا ہو کر چل دیا۔ اب نواب صاحب سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔ بیگم صاحب نے طرح طرح کے کھانے پکائے، مگر جہانگیر کی بات کہاں۔ بمبئی سے غدار شہر میں ایک سے ایک بڑھ کر ہوٹل اور رستران، مگر کہیں کا کھانا پسند نہ آیا۔ آخر سو روپے کا منی آرڈر تار پر بھجوایا اور جہانگیر کو بلوایا، تب لقمہ حلق سے اُترا۔ کھانے کا شوق ہو تو ایسا ہو!

بمبئی ہی کا ذکر ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سُن کر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے پوچھا، کیا کیا پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگا، چپاتی اور قورمہ۔ نواب صاحب نے کہا بس! تو کیا جواب دیتا ہے کہ اصل کھانا تو یہی ہے۔ باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں۔

نواب صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اخبارات اور اُردو، فارسی عربی کتابیں برابر پڑھتے رہتے تھے، انگریزی کے اخبارات اور مضامین بھی پڑھوا کر سنتے تھے۔ انگریزی کی ایسی کتابیں جو ان کے مذاق کی ہوتی تھیں اُن کا ترجمہ کرا کر پڑھتے اور بحث کرتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں فارسی، عربی اور انگریزی کی اعلا درجے کی کتابیں تھیں۔

سرسیّد کی وفات کے قریب زمانے ہی میں اُردو کی مخالفت کا آغاز ہو گیا تھا اگرچہ سرسیّد کی حالت اس وقت نازک تھی تو بھی اس جواں ہمت بڈھے نے اس کے متعلق لکھا پڑھی شروع کر دی تھی۔ محسن الملک کے زمانے میں اس مخالفت نے اور زور پکڑا۔ اُردو کی حفاظت اور حمایت کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی جس کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں نواب محسن الملک نے بڑی زبردست اور پُرجوش تقریر کی، جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور جوش کی ایک لہر پھیل گئی۔ سر انٹونی میکڈانل اس وقت لفٹنٹ گورنر تھے۔ وہ ہندی کے

بڑے حامیوں میں سے تھے۔ اس نے کچھ ایسی دھمکی دی کہ نواب صاحب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا اور انجمن ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی۔ ان کی یہ کمزوری نہایت قابلِ افسوس ہے۔ شاید اندیشہ یہ تھا کہ اگر اُنھوں نے اس پر اصرار کیا تو انھیں کالج کی سکرٹری شپ سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کالج کی حالت اس وقت بہت نازک تھی، اِس لیے مصلحت اس میں سمجھی کہ اُردو کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ تاہم اُن کی یہ کارروائی بے اثر نہ رہی۔

نواب محسن الملک اسی شاہ راہ پر گامزن رہے جس کی داغ بیل سرسیّد ڈال گئے تھے۔ سیّد کے بعد محسن الملک نے ان کے کام کو جس طرح سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا یہ اُنھیں کا کام تھا۔ اُن کے بعد کوئی اُن کی یادگار بنائے یا نہ بنائے محسن الملک کا کام اُن کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

(مقدمہ تذکرۂ محسن)

مولانا محمد علی مرحوم

۱۹۳۳ء

ہندستانِ جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمد علی مرحوم "عجیب وغریب" شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت وشان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلا درجے کا مقرر تھا، لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دل دادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروّت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی، دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اِس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ہمکاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش

آتا تھا اور طرح طرح کے سُلوک کرتا تھا۔ لیکن جب بگڑتا تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اِس وقت اُسے نہ کسی کی عزّت آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اِسی لیے وہ اپنے ہمکاروں سے نباہ نہ سکا اور وہ لوگ جنھیں وہ چُن چُن کر لایا تھا آخرکار ایک ایک کرکے الگ ہو گئے۔ یوں تو ایک مدّت تک وہ عزیز مذہب سے بیگانہ سا رہا اور جب ادھر جھکا تو ایسا کہ بڑے بڑے جغادری مولوی اور کٹّر مُلّا بھی اس کے سامنے ہیچ تھے۔ وہ جب بھی کسی کام کو اُٹھاتا تو بڑی شان و شکوہ سے اُٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا لیکن تکمیل کو پہنچانا اس کی طبیعت میں نہ تھا۔ کامریڈ کس شان سے نکالا، قدر بھی اس کی، وہ ہوئی جو شاید ہی کسی اخبار کی ہوئی ہو۔ اپنے پرائے سب اُسے سر آنکھوں پر رکھتے تھے، لیکن جو اس کا حشر ہوا وہ بھی معلوم ہے۔ مُسلم نیشنل یونی ورسٹی (جامعہ ملّیہ اسلامیہ) کی بنیاد جس زور شور اور شدومد کے ساتھ ڈالی گئی اس کا حیرت انگیز منظر اب تک ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس وقت قومیت اور آزادی کی کھولن انتہائی نقطے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی ہفتے جب یونی ورسٹی کے نصابِ تعلیم و نظم و نسق پر غور کرنے کے لیے اُن کے رُفقا کی کمیٹی ہوئی ہے تو وہ سماں ہم کبھی نہیں بھول سکتے: "مجذوب کی بڑ" بولتے اور سُنتے آتے تھے لیکن اُس روز اپنے کانوں سُنی اور بڑی عبرت ہوئی۔ ان کے بعض سنجیدہ اور صاحب نظر رفیق جو اس مجلس میں شریک تھے ششدر و حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ وہ اس وقت اس خیال میں مست تھے (اور انھیں اس کا پورا یقین تھا) کہ کوئی دن جاتا ہے کہ ہندوستان ان کے قدموں کے تلے ہوگا اور اس کی حکومت کی باگ ان کے قوی ہاتھوں میں ہوگی۔ اس خیال سے ان کا اور ان سے زیادہ ان کے برادر بزرگ کا دماغ

بہک سا گیا تھا اور جو بات اس وقت ان کے منہ سے نکلتی تھی اس میں ایک عجیب مستانہ ادا اور بے تکا پن ہوتا تھا۔ خلافت کا ذکر جتنا کم کیا جائے بہتر ہے۔ اس کا غلغلہ صورِ اسرافیل کی طرح ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا اور وضیع و شریف عالم و عامی، ہندو اور مسلمان سب ہی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی وجہ سے حمیّت و جوش قومی کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی تھی لیکن جو انجام ہوا وہ بے کہے سب کو معلوم ہے۔ اب یہ ایک اسم بے مسمیٰ ہے۔ سانپ نکل گیا مگر ہم ابھی تک لکیر پیٹے جا رہے ہیں۔ محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وہ اپنے کاموں کے لیے گھر بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کر سکتے تھے، لیکن وہ اِس بے دردی، بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اُسے صرف کرتے تھے کہ ان کے کام بھی برباد ہو جاتے تھے اور خود بھی قلاش ہو جاتے تھے۔ ہم میں (خاص کر یو، پی والوں اور خصوصاً مسلمانوں میں) اب تک زمیندار کی شان قائم ہے جو بادشاہی شان کی نقل ہے۔ ہم اِنتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے۔ ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں، لوٹنا اور لٹانا۔

محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اُس کے رفقا اور اس کے ہم عصر اُس کے سامنے پودنے تھے مگر افسوس اُسے اپنے اوپر قابو نہ تھا اور یہی اس کی ناکامی کی اصل تھی۔ اس کے ایک دوست جو اُسے بچپن سے جانتے تھے اور جنھوں نے زندگی کی ہر منزل میں اُسے دیکھا اور اُس کا ساتھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ "محمد علی کو لیڈری نے تباہ کیا۔" اس میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ لیڈری کے قابل تھا بشرطیکہ اُسے اپنے نفس پر قابو ہوتا۔ وہ جس طرح بیماری میں پرہیز پر قابو نہیں رکھتا تھا اِسی طرح ہر معاملے میں

جوش کے وقت اپنے اختیار سے باہر ہو جاتا تھا۔

محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شی کے لیے ہم لڑ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے، جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں اس کے لیے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔

(از تبصرۂ سیرت محمد علی)
رسالۂ اُردو

شیخ غلام قادر گرامی

۱۹۲۳ء

گرامی سچّا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا، دُنیا کے معاملات سے بے خبر، لاابالی۔ اگرچہ دُنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالمِ خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا۔ گھر کا حال گھر والی جانے اور باہر کا حال باہر والے جانیں وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا۔ شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا تھا اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا۔ ذوقِ سخن ایسا اچھا تھا کہ شعر سُن کر وجد میں آجاتا تھا۔ صورت، شکل، وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا اچھّا شاعر اور صاحب ذوق ہوگا۔ اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا، تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے لڑتا ہے اور یہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی۔ دوستی کا سچّا اور دوستوں کا قدردان تھا۔

ضد ضرور تھی لیکن وہی بچّوں کی سی، منانے پر فوراً من جاتا تھا اور دوستوں کا کہنا مان لیتا تھا، لیکن سچ بات کہنے میں وہ بڑے بڑوں سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ تصنّع سے دُور، نہایت بے تکلّف اور آشنا پرست تھا۔ وہ بہت بھولا تھا مگر بکار شعر ہوشیار اور بکار دُنیا بے کار تھا۔ اگرچہ مدّتوں

دوآبہ گنگ وجمن اور حیدر آباد میں رہا مگر لب ولہجہ ٹھیٹ پنجابی تھا جو بعض وقت بڑا مزا دیتا تھا۔ غیر لوگ آ آ کر اصرار سے اس کا کلام سُنتے تھے مگر دوستوں کو وہ خود سُناتا، وہ بھی محظوظ ہوتے اور خود بھی محظوظ ہوتا۔ اگرچہ ہندی نژاد تھا مگر فارسی کا اُستاد تھا۔ اتنا کچھ لکھا مگر محاورۂ فارسی میں لغزش نہیں ہوئی۔ اُس کا کلام اُستادانہ تھا اور قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا۔ اس کے کلام میں جوش، گرمی اور شوکت پائی جاتی ہے۔ اس نے بڑے بڑے معرکے جیتے اور بڑے بڑے اُستادوں کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور کہیں ہیٹا نہیں رہا۔ اس کی وفات سے ایک بڑے اُستاد کی جگہ خالی ہوگئی اور اب چونکہ فارسی کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اس لیے اُمید نہیں کہ پھر کوئی گرامی پیدا ہو۔

(از تبصرۂ دیوانِ گرامی)
رسالۂ اُردو

حالؔی

۱۹۳۷ء

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالبِ علم تھا۔ مولانا حالؔی اُس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہوس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب اُس زمانے میں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ یادگارِ غالب کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمان عزیز فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے "مسدّس" لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطرتی سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جبکہ غفران مآب اعلیٰحضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ حیدر آباد اور تمام ریاست میں جو بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے

اور نظام کلب کے ایک حصّے میں ٹھیرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک اُن سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزّز عہدے پر فائض تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے جا کھڑی کی۔ یہ حضرت اِس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہوگئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اُس غریب کے رسید کردیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پُرسی کی اور کچھ دیر باتیں کرکے رُخصت ہوگئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیّر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا"۔ اُس روز کھانا بھی اچھّی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں"۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اُس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان اُن کے کلام میں ہے۔ اُن کی سیرت اور اُن کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسیّد کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسیّد بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے یا جو اُن سے

ملے ہیں وہ ضرور اس قول کی تصدیق کریں گے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی اُن سے ملنے آتا خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر اُن کے حُسنِ اخلاق کا مدّاح رہتا تھا۔ اُن کا رُتبہ بہت بڑا تھا مگر اُنھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ایک بار، جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمید الدین مرحوم اُن سے ملنے گئے تو سرو قد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

اِس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مُرتّبہ" لکھا کبھی "مولفہ" یا "مصنّفہ" کا لفظ نہ لکھا۔

آل انڈیا مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مشہور سفیر مولوی انوار احمد مرحوم کہتے تھے کہ ایک بار وہ پانی پت گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا، اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے مولانا کے مکان پر پہنچے۔ دالان کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے پردہ اُٹھایا اور جھانک کر دیکھا، مولوی صاحب فرش پر بیٹھے تھے اور سامنے آگ کی انگیٹھی رکھی تھی۔ اِنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اُٹھ کر ملے اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ مزاج پُرسی کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کھانا منگوایا۔ انوار احمد مرحوم کھانے کے بہت شوقین تھے۔ پانی پت کی ملائی بہت مشہور ہے۔ اُن کے لیے ملائی منگوائی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ وقت

بات چیت میں گزرا پھر اُن کے لیے پلنگ بچھوا کر بستر ا کر دیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔ یہ بھی تھکے ہوئے تھے پڑ کر سو رہے۔ مولوی انوار احمد کہتے تھے کہ رات کے بارہ ایک بجے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی رزائی کو آہستہ سے چھو رہا ہے۔ انھوں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولوی صاحب نے کہا میں ہوں آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہو تو یہ کمبل لایا تھا اور آپ کو اُڑھا رہا تھا۔ انوار احمد کہتے تھے کہ مجھ پر اُن کی اس شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

مہمان کے آنے سے (اور ایسا اکثر ہوتا تھا) وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سچّے دل سے خاطر تواضع کرتے تھے اور اُس کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا بہت ہی رقیق القلب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ اُن کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامروّت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مند اُن کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تعصب اُن میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملّت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انھیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا نجی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی اُن کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو

بُرا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف اُنھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

ہندی اُردو کا جھگڑا اُن کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا اور اُس نے ناگوار صورت اختیار کر لی تھی، لیکن باوجود اس کے کہ اُنھوں نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی اور اپنی تحریروں سے اُردو کا رُتبہ بہت بلند کر دیا، وہ انصاف کی بات کہنے سے کبھی نہ چوکے۔ چنانچہ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھتے ہیں :-

"آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اُس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اس کی رفع داد ہو سکتی ہے تو اس طریقے سے ہو سکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں جو در حقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اُس کی ایک پروان چڑھی اولاد ہے اس طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہر دل عزیز ہیرو نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اُردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور اُن کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں جیسی کہ لکھنؤ جانے سے پہلے تقریباً اہلِ دہلی کی زبان تھی۔ مذکورۂ بالا اختلاف سے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے، اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ

مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں
آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر
کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے
آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ جس سنسکرت کو یورپ کے محقق لاطینی و
یونانی سے زیادہ فصیح زیادہ وسیع اور زیادہ باقاعدہ بتاتے ہیں
اور جس کی تحقیقات میں عمریں بسر کر دیتے ہیں. مسلمانوں نے عام
طور پر کبھی اُس کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت
کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلے سنسکرت
کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف
شگفتہ اور فصاحت بلاغت سے لبریز ہے اُس کو بھی عموماً بیگانہ وار
نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ جو اُردو اُن کو اس قدر عزیز ہے اس
کی گریمر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔
عربی فارسی سے اس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں
کے اسما اُس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں باقی تمام اجزائے کلام
جن کے بغیر کسی زبان کی نثر و نظم مفید معنی نہیں ہو سکتی، برج بھاشا
یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان
میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر
ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ "دریا میں رہنا
اور مگرمچھ سے بیر"

یہ بات بعض لوگوں کو ناگوار گذری اور بعض اُردو اخباروں نے اس کی
تردید بھی چھاپی، لیکن جو سچی بات تھی وہ کہہ گزرے۔ اِس خیال کا اظہار انھوں نے

کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اُردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اُسے سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں ایک مقام پر فرماتے ہیں :۔

"اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دِلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبّع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اُردو زبان کی بُنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اُردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اُردو زبان میں بڑا حصّہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔"

ایک بار جب اُردو لغت کی ترتیب کا ذکر آن سے آیا تو فرمانے لگے کہ اُردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلاتکلّف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوب صورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ

اسی موقع کے لیے وضع ہوئے تھے اُنھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردُو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردُو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے، اور یہ کوئی حالی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہوگئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے۔ اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کرکے اپنی فضیلت جتانا یا اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا، ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ مثلاً

گرچہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

یا

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اُن کا ذوقِ شعر اعلا درجے کا تھا جیسا کہ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور مقدمۂ شعر و شاعری سے ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں

اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے۔ لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آپڑتی تو وہ کھُل کر اس کے نکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہوگیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اُس سے اپنا کلام سُنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اُسے بھی اپنے کلام سُنانے کا شوق گُدگُداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اُس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اِس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر اُن سے اس کی توقع رکھتا ہے (بعض شاعر تو اس کے لیے بے چین رہتے ہیں) لیکن بعض لوگ سچّے دِل سے اِس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی بڑے شاعر کا کلام اُس کی زبان سے سُنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے، وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کم زور ہے، اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذرِ لنگ ہی نہ تھا، اس میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدر آباد میں تھا، ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بُلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے، فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سُنائیے۔ مولانا نے وہی حافظے کا عذر کیا۔ ہر چند لوگوں نے کہا کہ کچھ بھی جو یاد ہو فرمائیے مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی، وہ چپکے سے اُٹھے اور کہیں سے "دیوانِ حالی" لے آئے اور لا کے سامنے رکھ دیا، اب مجبور ہوئے، کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا۔

آخر اُنھوں نے یہ غزل سُنائی جس کا مطلع ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، اُن کا ذکر نہیں لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ اُنھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا، نظم اُن کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی۔ ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

سرسیّد تو خیر اُس زمانے میں موردِ لعن و طعن تھے ہی اور ہر کس و ناکس اُن پر مُنھ آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سیّد احمد خاں سے تھا، یوں ہی مردود سمجھا جاتا تھا، اُس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جُدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی۔ اور مقدمہ شعر و شاعری نے تو خاصی آگ لگا دی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں، وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ اُنھیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی اُنھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی

صدا آنے لگی۔ اودھ پنچ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین "مقدمہ" کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب و غریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ جن مضامین کا عنوان

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

ہو تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا اُن میں عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال اُن کے بہت بڑے اوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں اُن کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادیب کا بڑا کمال ہے۔ یہ بات صرف اساتذہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آکر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے۔

اُن کا ایک نواسہ تھا۔ ماں اُس کی بیوہ تھی اور اُس کا یہ ایک ہی لڑکا

تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہی۔ اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صرع کی بیماری میں مبتلا تھا۔ اِس لیے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اُف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوال کرتا، یہ بڑے تحمّل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا، یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا یہ اس کی دل دہی کرتے۔ وہ روٹھ جاتا، یہ اُسے مناتے، وہ لڑکر گھر سے بھاگ جاتا، یہ اُسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ اِنھیں دھمکی کے خط لکھتا، یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اُس کی بیماری کا خیال اور کچھ اُس کی دُکھیا ماں کا پاس، وہ سب سے زیادہ اُس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ، خفگی، روٹھنے مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اِظہار نہ کرتے۔ اگرچہ جوان ہوگیا تھا مگر مزاج اُس کا بچّوں کا سا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اُس نے مولانا کو ایسا دھکّا دیا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجّاد حسین صاحب نے دیکھ لیا وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اُس کے ایک تھپّڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت کرنی موقوف کردی اور جب تک اُنھوں نے اُس لڑکے سے معافی نہیں مانگی، اُن سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دُنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے اُس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ اُن کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ رُپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدرآباد میں اُن کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو اُنھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے جس کے تخمیناً پچھتّر حالی ہوتے ہیں۔ ایک مدّت تک پچھتّر ہی ملتے رہے، بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدرآباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں وہ چاہتے تو

کچھ مشکل نہ تھا، مگر اُنھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اُس کے لیے وہ بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سوا ایک آدھ کے اُنھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ اُن کی تصانیف مالِ یغما تھیں۔ مسدّس تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مروّت کے پُتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہوتی کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آجاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے، وہ بیٹھے سُنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اُٹھ کر چلے جاتے یا کنایتہً اشارۃً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اُٹھ جاتے۔ حیدرآباد کے قیام میں، میں نے اِس کا تماشا خوب دیکھا۔

اِسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدرآباد تشریف لائے سرسیّد کی برسی کا جلسہ بھی اُنھیں کی موجودگی میں ہوا۔ اُن سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسے کے لیے سرسیّد کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اُس موقع کے لیے بہت اچھّا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا، پڑھتے پڑھتے شام ہوگئی، اِس لیے آخری حصّہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آکر فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہوگیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اچھّا ہوا اندھیرا ہوگیا ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اُسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدردانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گذرتی تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ پیسہ اخبار جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگذاریوں سے خوش ہو کر اُن کی تعریف میں نظم لکھی۔ ہمدرد اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سُجھاتے۔ اُن کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ اُن کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیّاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آئندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ جہاں تک مجھے اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور اُن کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں ان کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو اُن کا نام تک سُننے کے روادار نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیرِ ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے، اُن میں دونوں نے طبع آزمائی

کی۔ برکھارُت، حُبِّ وطن، نشاطِ اُمید اُسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے اُن کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثّار ہیں مگر شعر کے کوچے میں اُن کا قدم نہیں اُٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں۔

> "۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمنِ پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔"

بات میں بات نکل آتی ہے۔ جب حیاتِ جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لیے، ایک مولوی عزیز مرزا کے لیے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لیے جو اُس وقت اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب اُن کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ "یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔" وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سُن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوءِ ادب تھا، لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بے کار تھا۔

اب اس کے مقابلے میں ایک واقعہ سُنیے۔ قیامِ حیدرآباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اُس زمانے میں وہ "دکن ریویو" نکالتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔

مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کیے چُپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

خود مولانا پر بہت سی تنقیدیں لکھی گئیں اور نکتہ چینیاں کی گئیں لیکن اُنھوں نے کبھی اس کا بُرا نہ مانا۔ مولانا حسرت موہانی کا واقعہ جو مجھ سے مولوی سلیم نے بیان فرمایا اور اب شیخ اسمٰعیل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے، بہت ہی پُر لطف ہے۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں جب مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی نے علی گڑھ سے "اُردوئے معلّٰی" جاری کیا۔ تو جدید شاعری کے اس مجدّدِ اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع کیا۔ مولانا کے پاس اگرچہ "اُردوئے معلّٰی" باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے۔ اور حسبِ معمول سیّد زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سیّد صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔

اپنے کتب خانے میں گئے۔ اور "اُردوئے معلّٰی" کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے، خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کرکے حسرت اور "اُردوئے معلّٰی" کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ! خوب لکھا، کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سیّد صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے۔ ارے مولانا! یہ دیکھئے، آپ کی نسبت کیا لکھا ہے؟ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کئے: "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرّبِ زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اُردو کی خدمت سے روکیں اُتنا ہی اچھّا ہے۔" فرشتہ منش حالی ذرا مکدّر نہیں ہوئے۔ اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ "نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔" کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ "حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھوگے؟" جواب دیا کہ "جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔"[1]

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا نہ ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اُس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کلام اور اُن کی تصانیف اس کی شاہد ہیں۔ اور جو سمجھتے تھے وہ کرکے دکھا دیا۔ آج سینکڑوں

---

[1] رسالہ زمانہ ماہ دسمبر ۱۹۱۰ء جلد ۱۱ نمبر ۶ صفحہ ۲۹۸ تا ۲۹۹
(ماخوذ از تذکرۂ حالی صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۸)

تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن اُن میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنّفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اُس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکّر بھی ہو اور عملی بھی، ایسا شاذ ہوتا ہے۔ تاہم مولانا نے اپنی بساط کے موافق عملی میدان میں بھی اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ایک تو اُنھوں نے اپنے وطن پانی پت میں مدرسہ قائم کیا، جو اب حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے موسوم ہے۔ اور ایک پبلک اور نٹیل لائبریری قائم کی جو پانی پت میں سب سے بلند اور پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ اس میں کتابوں کا اچھّا خاصا ذخیرہ ہے جس سے پانی پت والے مستفید ہوتے ہیں۔

مولانا کم زوروں اور بیکسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے، اُنھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ مناجات بیوہ اور چُپ کی داد یہ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص، جوشِ ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی آنکھیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف اُن کا کلام پڑھا ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اُٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے۔ خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر

کوشش کرتے رہے، لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب اُن کے نام حیدرآباد میں ایک روز "اولڈبوائے" آیا تو اُسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخراپن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھیں علی گڑھ کے طلبہ سے اس سے اعلا توقع تھی۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلا درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ یہ گفتگو انھوں نے کچھ اس ڈھنگ سے کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ خود کوئی ڈراما لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے سے مجبور ہیں۔

آخر میں اُن کی دو بڑی تمنّائیں تھیں۔ ایک تو اُردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اُصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد پر ہوا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے، پانی بہت لطیف ہے اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی پُرفضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آئیے۔ صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا۔ اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر اُن کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ ہوئے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے، ضعیفی کا عالم ہے، طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دور کا سفر خلاف مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے

لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم ادھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اُس وقت میں تمھارے ساتھ ہو لوں گا، پھر کوئی چون وچرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ جب ملتے تو اُسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس بدسلوکی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اُسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب اُن سے ملتے تو اُن کے حُسنِ سلوک اور محبّت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر ملتے ہی نہیں، اُن کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں، ورنہ یوں دُنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

سر سیدؒ راس مسعود

۱۸۹۴ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ ہی میں ہوا۔ اُس وقت اس کا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس تھا۔ ابتدائی نام اس کا ایجوکیشنل کانگریس تھا، لیکن سید محمود نے اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ صرف مشرقی تعلیم یا ملّانوں کی کانفرنس ہے اور کچھ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی مناسبت سے یہ دوسرا نام تجویز کیا اور منظور بھی ہو گیا اس زمانے کی کانفرنس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ لوگ بڑے شوق اور رغبت سے آ آ کر شریک ہوتے تھے۔ یوں تو ہر صوبے کے لوگ ہوتے تھے لیکن پنجاب اور یوپی والے کثرت سے نظر آتے تھے، شوق اور رغبت کی وجہ تھی ایک تو سر سید اس وقت زندہ و سلامت موجود تھے، ان کی تقریریں اور باتیں سُننا تو ایک طرف اُن کی زیارت کر لینا ہی بڑی بات تھی۔ اُن کا بھاری بھرکم جثّہ، پُر رعب چہرہ، ان کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔ جب وہ ہال میں آتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جہاز آ رہا ہے۔ دوسرے مولانا حالی کی دل ہلا دینے والی نظمیں، مولانا شبلی کے عالمانہ مضامین، مولانا نذیر احمد کی دھنواں دھار اور پُر لطف تقریریں روز روز کہاں سُننے میں آتی تھیں یہ موقع نصیبوں سے مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی نواب محسن الملک بھی آ نکلتے تھے اور اپنی خوش بیانی سے سب کو رجھا جاتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر سر سید آخری دن رکھتے تھے تاکہ لوگ جانے نہ پائیں، اور واقعی اس کے انتظار میں برابر جمے رہتے تھے۔ ان کے لکچر کے دن سُننے والوں کا

ایسا ٹھٹھ لگ جاتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں بہت سے ذی علم، باوضع اور نامور لوگوں سے ملنے کا موقع مل جاتا، جو یوں برسوں نصیب نہ ہوتا۔ غرض یہ بڑی پُر لطف صحبت ہوتی تھی اور شرفا کا بڑا اچھا مجمع ہوتا تھا۔

میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اسی سال اور اسی کانفرنس کے اجلاس میں مسعود کی بسم اللہ ہوئی۔ گویا سر سید نے اسی روز سے اپنے اکلوتے پوتے کو قوم کی نذر کر دیا تھا۔ اسٹریچی ہال کے صدر میں چبوترے پر خاص خاص لوگ بیٹھے تھے۔ وہیں مسعود کو لاکر کرسی پر بٹھایا۔ مسعود کی ایک طرف راجہ جے کشن داس تھے دوسری جانب پروفیسر آرنلڈ۔ چنانچہ سید نے اپنی تقریر میں اسی طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ داہنی جانب میرا ڈاڑھی منڈا ہندو دوست ہے جسے سید محمود چچا کہتے ہیں، اور بائیں جانب عیسائی مذہب کا انگریز۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے کسی مذہب و ملت سے تعصب نہیں اور میں انھیں بھی ایسا عزیز سمجھتا ہوں جیسے اپنے مسلمان بھائیوں کو۔ بسم اللہ پڑھانے کے لیے جھنجھانے سے ایک دقیانوسی مولوی (پیرِ فرتوت) بلائے گئے تھے، انھوں نے بسم اللہ پڑھائی۔ غالباً یہ مولوی اکبر کے خاندان کے تھے۔ اس کے بعد سر سید نے مختصر مگر بہت پُر لطف اور پُر اثر تقریر فرمائی جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ میرے خاندان کی یادگار صرف یہ ایک بچہ ہے۔ اگرچہ میں غریب ہوں مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ یہ تقریب ذرا دھوم دھام سے نہ کرتا اور دل کے حوصلے نہ نکالتا۔ لیکن یہ بُرا نمونہ پیش نہیں کرنا چاہتا، اس کے بدلے میں انھوں نے پانسو روپے کالج کے نذر کیے اور ان کے بعض دوستوں نے بھی کالج کو کچھ کچھ رقمیں دیں۔ اس تقریب کے وقت کانفرنس کے تمام نمایندے اور کالج کے اکثر طالب علم موجود تھے۔ اور سب ایسے خوش خوش نظر آتے تھے گویا اپنے کسی خاص عزیز کی تقریب میں شریک ہیں۔

سیّد کی خوشی میں سب کی خوشی تھی۔ تقریب کے خاتمے پر شیرنی تقسیم ہوئی۔ اُن موتی چور لڈوؤں کا مزہ مجھے اب تک یاد ہے۔

ایک روز میں سیّد محمود کے پاس بیٹھا تھا، مسعود اندر گھر میں سے نکل کے آئے تو میں نے کہا کہ یہ اب بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں کرتے۔ کہنے لگے میں اسے خود پڑھاؤں گا اور پھر طریقۂ تعلیم اور اُصولِ تعلیم پر لکچر دینا شروع کر دیا۔ محمود تو کیا پڑھاتے، دادا ہی ان کے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ایسی ہوئی جیسے مسلمانوں کے پُرانے شریف خاندانوں میں ہوا کرتی تھی۔ کالج کے مشہور حافظ بخشا انھیں قرآن پڑھاتے تھے اور تختی پر لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی مگر اُن کا خط کبھی اچھّا نہ ہوا۔

وہ دادا ہی کی آنکھوں کے سامنے رہتے اور وہیں پڑھتے لکھتے تھے۔ ایک سال میں گرمی کی تعطیلوں میں کالج ہی میں رہا۔ ایک دن سیّد صاحب نے مولوی حمید الدین مرحوم اور مجھ سے فرمایا کہ میرے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں انھیں کسی وقت آکر ترتیب سے لگا دو۔ سیّد صاحب کا قاعدہ تھا کہ صبح کام کرنے بیٹھتے تو بارہ ایک بجے تک کام کرتے اور پھر کھانا کھا کے تھوڑی دیر ستانے کے لیے وہیں لیٹ جاتے۔ ایک روز دوپہر کو اسی کمرے میں ہم کتابیں ٹھیک کر رہے تھے اور سیّد صاحب دوسری طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے اور مسعود اُن کی بغل میں لیٹا تھا۔ اتنے میں سیّد صاحب نے اپنی بھاری گنجیلی آواز میں مسعود کو لوری سنانی شروع کی۔ ہمیں اُن کے گانے کی آواز سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ ضبط نہ کر سکے اور چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر بھاگ گئے۔ وہ مسعود کو بہت عزیز رکھتے تھے، وہ اُن کی آنکھوں کا تارا تھا اور ساری اُمیدیں اُسی پر تھیں۔ سرسیّد نے اپنی کوٹھی ہی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا مکان بنا دیا تھا جس میں

مسعود پڑھتے تھے۔ اُس مکان کا نام "مسعود کا مکتب" پڑ گیا تھا۔

دادا کے مرنے کے بعد مسعود یتیم سے ہو گئے۔ سید محمود کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی اور مسعود کا ان کے پاس رہنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا گیا۔ آخر کچھ دنوں کے بعد وہ مسٹر مارِسن (سر تھیوڈور) کے ہاں اُٹھ گئے۔ مارِسن اور اُن کی بیوی نے اُن کو اس طرح پالا پرورش کیا جیسے کوئی بیٹوں کی پرورش کرتا ہے۔ اور ان کے اخلاق و آداب کی نگرانی اسی طرح کی جیسے مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں ہوتی ہے۔ دونوں میاں بیوی ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور اُن کے یہ تعلقات آخر دم تک رہے۔ مسعود بھی اپنے تمام معاملات میں سر تھیوڈور سے اس طرح مشورہ کرتے جیسے کوئی اپنے بزرگوں سے کرتا ہے اور اُن کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔

سید محمود کی وفات کے بعد دو سو روپے ماہانہ جو سرسید کو گورنمنٹ سے بصلۂ خیر خواہی ملتے تھے، محمود بیگم کے نام ہو گئے۔ یہ بھی سر تھیوڈور مارِسن ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

سر تھیوڈور کے چلے جانے کے بعد مسعود کالج میں داخل ہو گئے۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کالج کی جماعت میں داخل ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد گورنمنٹ نے انھیں ولایت کا تعلیمی وظیفہ دے کر انگلستان بھیج دیا۔ اکسفورڈ یونی ورسٹی سے اُنھوں نے ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کی سند بھی لی۔ پانچ سال بعد ہندوستان آئے تو پٹنے میں وکالت شروع کی۔ لیکن وکالت میں اُن کا دل نہ لگا اور جونہی اُنھیں گورنمنٹ نے پٹنہ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پیش کی تو اُنھوں نے قبول کر لی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ سنا ہے کہ وہ اپنے طلبہ اور کالج کے پروفیسروں

میں بہت مقبول تھے۔ اور جب حیدر آباد میں ناظم تعلیمات کا عہدہ خالی ہوا تو ان کی خدمات گورنمنٹ انگریزی سے حیدر آباد میں مستعار لے لی گئیں۔ ان کے بلانے میں دسمر، اکبر حیدری نے خاص طور پر کوشش کی۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

نظامت تعلیمات پر فائز ہونے کے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اورنگ آباد کا دورہ کیا۔ میں اُس زمانے میں صوبۂ اورنگ آباد کا صدر مہتمم تعلیمات تھا۔ انھوں نے میرے ہاں قیام کیا۔ اس سے قبل میں نے انھیں سرسری طور سے کئی بار دیکھا تھا، اب حقیقی ملاقات ہوئی۔

جس زمانے میں یہ حیدر آباد آئے تو یونی ورسٹی قائم ہونے کی ابتدائی تحریک ہو چکی تھی۔ مسعود اوّل اوّل ذرا مذبذب رہے کیوں کہ اُس وقت دیسی زبان کے ذریعے سے اعلا تعلیم دینے کا مسئلہ ایسا تھا جو مشکل سے کسی کے خیال میں آسکتا تھا۔ اور اگر خیال میں آئے بھی تو اس کا عمل میں لانا ایک ڈراؤنا خواب معلوم ہوتا تھا۔ ساری مشکل یہ تھی کہ ہندستان کی کوئی زبان اس بار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب کامل غور اور گفتگو کے بعد انھیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ صحیح طریقہ یہی ہے اور تعلیم کا حقیقی منشا صرف اپنی زبان ہی کے ذریعے سے پورا ہو سکتا ہے تو اُنھوں نے پورے انہماک کے ساتھ اس منصوبے کو عمل میں لانے کی تائید کی جسے اُس وقت بعض لوگ جنون سے تعبیر کرتے تھے اور اکثر اس جسارت پر حیرت زدہ تھے اور اس جدّت بلکہ بدعت کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے بعد وہ جب تک حیدر آباد میں رہے جامعۂ عثمانیہ کی کام یابی اور ترقی کے لیے برابر ساعی رہے اور جب تک کسی مستقل پرنسپل کا تقرر نہ ہوا اُنھوں نے کچھ دنوں تک پرنسپلی کی خدمت بھی انجام دی۔

ناظم تعلیمات کی حیثیت سے وہ سب سے زیادہ کام یاب رہے۔ اِس سے

قبل یہاں کی تعلیم میں اس سرعت کے ساتھ کبھی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے تعلیم کی اصلاح اور ترقی کے لیے نئی نئی اسکیمیں بنائیں اور اپنے ذاتی اثر اور کوشش سے ان تجویزوں کو عمل میں لانے کے لیے گورنمنٹ سے بڑی بڑی رقمیں منظور کرائیں۔ اور سر ریجنالڈ گلانسی اور سر اکبر حیدری نے (جو یکے بعد دیگرے صدر المہام فنانس ہوئے) ان کو مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ جس وقت نظامت تعلیمات کی خدمت اپنے ہاتھ میں لی تو مدارس کی تعداد ۱۲۵۴ اور طلبہ کی تعداد ۹۳۲۸۹ تھی اور جب وہ اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تو مدارس کی تعداد ۴۱۸۸ اور طلبہ کی تعداد ۲۷۱۸۲۱ تھی۔ کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ سب سے زیادہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کی جو تعلیم کے ہر شعبے کی اصل بنیاد ہے۔ ان کے برتاؤ اور ہمدردی اور اخلاق نے عہدہ دارانِ تعلیمات پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ وہ لوگ اشاعتِ تعلیم کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر کرتے تھے اور ادھر افسرانِ بالا ان کی اس قدر وقعت اور عظمت کرتے تھے کہ ان کی ہر تجویز بلا تامل منظور کر لیتے۔

انھیں اس خدمت پر بارہ سال ہوئے تھے کہ گھبرا کر بھاگنے کی ٹھانی۔ نظام گورنمنٹ سے اُن کا معاہدہ تھا کہ دس سال خدمت کرنے کے بعد اگر وہ سبکدوش ہونا چاہیں گے تو گورنمنٹ انھیں ایک ہزار روپے وظیفہ دے گی۔ چنانچہ وظیفہ لے کر اپنی صحت کی اصلاح کے لیے ولایت سدھارے۔ اُن کی صحت درحقیقت اچھی نہیں رہی تھی۔

حیدرآباد کے زمانۂ ملازمت میں ایک بار وہ رخصت لے کر جاپان اور کوریا کی سیاحت کے لیے گئے اور دوسری بار نظام گورنمنٹ نے تعلیمی نظم و نسق کی تحقیق کے لیے بھیجا۔ وہاں سے آکر جو رپورٹ انھوں نے اس ملک کی تعلیم پر

لکھی ہے وہ ان کی اچھی یادگار ہے. جاپان کے مناظر اور جاپان والوں کے بے حد مدّاح تھے۔ ان کے ایثار، حبّ وطن اور جفاکشی کی بے انتہا تعریف کرتے تھے۔ خود اس کتاب (تعلیمی نظم ونسق جاپان) کے لکھنے والے کا قلم اور دل ان جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ جاپان کی اعلا سوسائٹی میں اُنھوں نے بڑا اچھّا اثر پیدا کیا اور بعض سے اُنھوں نے گہرا دوستانہ پیدا کر لیا تھا۔

حیدرآباد سے جب جانے لگے ہیں تو بڑے بڑے منصوبے تھے کہ یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔ جب وہ یہ کہتے تھے تو مجھے سیّد محمود یاد آجاتے تھے، ان کے بھی بڑے بڑے منصوبے تھے، یہی نہیں بلکہ جو کتابیں وہ لکھنا چاہتے تھے ان کے خاکے تیار کر رکھے تھے اور ابواب اور فصول کی پوری تفصیل قلم بند تھی۔ کچھ دنوں تو وہ جرمنی وغیرہ میں اپنی صحت کی اصلاح میں مصروف رہے، اس کے بعد جب اچھّے ہوئے تو ان کو دو مختلف مقامات سے دو متضاد خدمتیں پیش ہوئیں۔ اعلاحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے انھیں اپنی گورنمنٹ کی پولیٹیکل سکرٹری کی خدمت پر لینا چاہا اور اسی اثنا میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی وائس چانسلری تھی جو اُن کے لیے حاضر تھی۔ حیدرآباد کی ملازمت نسبتاً بہت آسان، بہت پُرلطف، اُن کی طبیعت کے عین مطابق، تنخواہ زیادہ اور آئندہ کی ترقی کی قوی اُمیّد۔ ادھر مسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری بڑی مشقت طلب ٹیڑھی اور کٹھن خدمت تھی، جو اچھّے بھلے آدمی کو دیوانہ بنا دے اور بڑے بڑوں کو ناک چنے چبوا دے۔ اس میں ہاتھ ڈالنا بلا مبالغہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سیّد احمد خاں کی روح نے مسعود کے دل پر القا کیا کہ پھولوں کی سیج کو چھوڑ کر کانٹوں بھری گدّی قبول کر لی۔ ان کا یہ ایثار فی الحقیقت قابلِ قدر تھا۔ یہاں بھی سر تھیوڈور ماریسن کی

سعی اور ہم دردی کارفرما تھی۔ اُس کش مکش کے زمانے میں جب کہ مُسلم یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے لیے ہندستان کے کونے کونے میں تلاش ہو رہی تھی، سر تھیوڈور کا خط میر ولایت حسین صاحب کے نام پہنچا۔ خط کیا تھا از غیبی گولہ تھا۔ اس خط کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ انھیں ہندستان کے مُسلمانوں سے کس قدر گہری ہم دردی تھی اور مسعود کی اُن کے دل میں کیسی کچھ قدر تھی۔ اُنھوں نے اس میں لکھا تھا کہ کس قدر افسوس کی بات ہی کہ آپ لوگ اپنی یونی ورسٹی کے لیے پرو وائس چانسلر کا انتخاب نہ کر سکے اور گورنمنٹ سے اس بارے میں مدد چاہی، گویا اپنی ناقابلیت کا اعتراف کر لیا اور اپنا اختیار گورنمنٹ کو دے دیا۔ ایک انگریز پرو وائس چانسلر کے دل میں آپ کی کیا قدر ہوگی جب وہ دیکھے گا کہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ میں خود اور مسٹر بیک اور مسٹر آرنلڈ جن کا نام علی گڑھ میں کام کرنے والوں میں بڑی تعریف کے ساتھ لیا جاتا ہی، معمولی انگریز تھے مگر سرسید کی صحبت میں کام کے آدمی بن گئے۔ اِس لیے آپ کو چاہیے کہ اوّل مسعود کو اُس کے دادا کی جگہ بٹھاؤ یعنے وائس چانسلر بناؤ اس کے بعد وہ خود اپنا پرو وائس چانسلر تجویز کر لے گا۔ ایک فقرہ اس میں بڑا زبردست تھا۔ وہ یہ کہ اگر حضرت جبرئیل بھی آسمان سے اُتر آئیں تو مسلم یونی ورسٹی کو نہیں سنبھال سکتے اور کوئی یہ کام کر سکتا ہی تو وہ مسعود ہی۔ نواب صاحب بھوپال جو اپنی والدہ (یونی ورسٹی کی چانسلر) کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ اس بارے میں بڑے متفکر اور کوشاں تھے۔ وہ مسٹر لشل ہیل کو جو گورنمنٹ آف انڈیا میں کمشنر تعلیمات تھے، اس خدمت پر لینا چاہتے تھے۔ ان سے دریافت کیا تو اُنھوں نے کہا میں سوچ کر جواب دوں گا۔ چند روز بعد اُنھوں نے ایک صاحب کو جو اس معاملے میں بہت

پیش پیش تھے اور خود بھی یونی ورسٹی کی کونسل میں گھسنا چاہتے تھے، لٹل ہیل کے پاس بھیجا کہ جا کر دریافت کریں کہ کیا فیصلہ کیا۔ مجھے بھی ان صاحب کے ساتھ کر دیا کہ اگر انھیں (لٹل ہیل کو) کچھ عذر ہو یا کسی قسم کے شبہات ہوں تو میں ان کا اطمینان کر دوں۔ اس سے ایک روز پہلے مسٹر مارسین کا خط یار لوگوں نے کسی ترکیب سے اُڑا کر شائع کر دیا تھا۔ اس کے پڑھنے کے بعد اس نے صاف انکار کر دیا۔ اب معاملہ کورٹ میں پیش ہوا۔ کورٹ کا اجلاس شروع ہوا تھا کہ یکایک بیگم صاحبہ بھوپال آپہنچیں۔ سب ششدر و حیران رہ گئے کہ یہ کہاں! سب کے سب تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر (وائس چانسلر) کرسیٔ صدارت چھوڑ کر الگ جا بیٹھے۔ بیگم صاحبہ نے خود ایک مختصر اور پُر اثر تقریر میں مسعود کا نام تجویز کیا اور اس کی تائید کے لیے حاضرین کو ترغیب دی۔ یہ کہہ کر وہ جس طرح آئیں تھیں اُسی طرح یکایک چلی گئیں۔ کورٹ میں چند تقریروں کے بعد مسعود کا نام بالاتفاق منظور کر لیا گیا۔

مسعود سا وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی کو کبھی نصیب ہوا تھا نہ شاید آئندہ ملے۔ یہ کم نصیب یونی ورسٹی اُس زمانے میں عجیب ضغطے میں پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی بدنامی اور رسوائی دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ حاسدوں کو حیلہ ہاتھ آ گیا تھا، اُنھوں نے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا۔ مسعود کے آتے ہی رنگ بدل گیا۔ اُس نے اپنی ذاتی وجاہت اور اثر اور کوشش سے بدنامی کا دھبّا مٹایا۔ کھوئے ہوئے وقار کو قائم کیا، بڑھایا اور اوج تک پہنچا دیا۔ مایوسی کو اُمید سے بدل دیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ رُپیہ اتنا لایا کہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ سیّد احمد خاں کو اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ملتا تو انھیں شادیٔ مرگ ہو جاتی۔ سائنس کا شعبہ

اُس کی ایسی یادگار ہو کہ جب تک یونی ورسٹی قائم ہو اُس کی یاد تازہ رہے گی۔ لیکن ایک کام جو بہت ضروری تھا اور مسعود ہی کو کرنا چاہیے تھا، وہ رہ گیا اور اُس کی نوبت نہ آئی۔ یعنی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی اصلاح و ترقی۔ یہ شعبہ اِس وقت جس کس مپرسی کی حالت میں ہو وہ قابلِ افسوس ہو۔ اب یہ ان کے جانشین کا فرض ہو کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ اور جس طرح مسعود شعبۂ سائنس بنا کر اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں یہ شعبۂ اُردو کو وسیع اور مضبوط بنا جائیں جو مسلم یونی ورسٹی کی شان کے شایاں ہو۔

طلبہ میں وہ خاص طور پر مقبول تھے۔ ایک تو ان کے ذاتی اخلاق ایسے تھے کہ آدمی اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا، دوسرے طالب علموں سے اُنھیں دلی ہم دردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے۔ کالج کے کسی پرنسپل یا سکرٹری یا یونی ورسٹی کے کسی وائس چانسلر کا برتاؤ طلبہ سے ایسا ہم دردانہ نہیں رہا تھا نہ کسی نے طالب علموں کی ایسی دست گیری کی تھی جیسی مسعود نے۔ علاوہ وائس چانسلر کے فنڈ کے جو اُنھوں نے طلبہ کی امداد کے لیے قائم کیا تھا جس کے لیے جگہ جگہ سے سر پر سوار ہو کر روپیہ سمیٹ سمیٹ کر لاتے تھے، وہ اپنی جیب سے بھی نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے، سفارشیں کرتے تھے، نوکریاں دلواتے تھے، ان کی مشکلوں میں کام آتے تھے، جائز معاملات میں اُن کی حمایت کرتے تھے، اُن کے وقار کو اپنا وقار اور ان کی عزّت کو اپنی عزّت سمجھتے تھے۔ نام و نمود کی خاطر یا ٹالنے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ اُن کے سچّے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے۔ اور طلبہ بھی ان سے ویسی ہی محبّت کرتے تھے اور ان کی سعادت مندانہ اطاعت کرتے تھے۔

لیکن افسوس کہ وہ مسلم یونی ورسٹی میں زیادہ مدّت تک نہ رہ سکے اور

نہ وہ رہ سکتے تھے۔ زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اُٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں انھیں خوشی ہوتی ہے۔ کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کُبڑا دیکھنے ہی سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اُن کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے۔ جس معاملے پر وہ شکستہ خاطر ہو کر مستعفی ہو گئے وہ کوئی بڑا معاملہ نہ تھا لیکن آنے والے طوفان کی خبر دے رہا تھا۔ اگر اس وقت نہ جاتے تو غالباً آیندہ بُری طرح جانا پڑتا۔ وہ اگر چاہتے تو بہت آسانی سے اپنے مخالفوں کو نیچا دکھا سکتے تھے۔ کورٹ میں اُن کے حامیوں کی بہت زیادہ تعداد تھی اگر ان کا ایک اشارہ بھی پاتے تو اس قدر تعداد میں آجاتے کہ مخالفین کی کچھ پیش نہ جاتی۔ لیکن جتھے بندی اور جوڑ توڑ سے انھیں طبعی نفرت تھی، وہ اس عیب کو مسلم یونی ورسٹی سے مٹانا چاہتے تھے، اس لیے اس حربے سے کام لینا وہ موجب عار سمجھتے تھے۔ وہ لوگ سوچ سمجھ کر اور مسلح ہو کر آئے تھے اور یہ نہتے جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں عزت کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لیکن جن حضرات نے اُنھیں نکالا وہ بھی اپنی حرکت سے خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ انھیں سب سے زیادہ پچھتانا پڑا ہوگا۔ کیوں کہ اُن کا منصوبہ کہ مسعود کو نکال کر اپنی کسی کٹ پتلی کو اس جگہ لائیں، پورا نہ ہوا اور اس طرح اُنھیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی جس کے وہ مستحق تھے۔

اس سے ایک بات ضرور معلوم ہوئی کہ مسعود میں مقابلے کی قوت مطلق نہ تھی۔ وہ بڑے ذکی الحس تھے۔ ذرا سی مخالفت میں پریشان ہو جاتے تھے، خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی تو اُنھیں بڑا

صدمہ ہوتا تھا۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے۔ کارزارِ دُنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے پسپا ہو جانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے۔

علی گڑھ سے جو آئے تو سیدھے یورپ چل دیے۔ یہ اُن کی عادت تھی۔ جب وہ کسی معاملے سے سخت پریشان ہوتے تو انگلستان کا رُخ کر دیتے۔ حیدرآباد میں بھی یہی ہوا۔

یورپ سے واپسی پر نواب صاحب بھوپال نے ازراہ قدردانی انھیں اپنے ہاں ایک اعلا خدمت پر لے لیا۔ وہاں بھی اُنھوں نے بہت سے بھلائی کے کام کیے، بہت سے غریبوں کی مدد کی اور بہت سے زخمی دلوں پر مرہم رکھا میرا قیاس ہے، ممکن ہے غلط ہو، کہ وہاں کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ البتہ ایک بات سے وہ ضرور خوش تھے۔ کہتے تھے کہ مجھے خوش قسمتی سے ایک شخص کے ماتحت کام کرنا پڑتا ہے جس سے جی کھول کر اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور جو اچھّی بات اور اچھّے کام کی قدر کرتا ہے۔ آخر یہیں اپنی زندگی کی آخری منزل ختم کر دی اور علی گڑھ میں اپنے باپ اور دادا کے پہلو میں جا سوئے۔

مرنے والے میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ آدمی کو کچھ تو ورثے میں باپ دادا سے ملتا ہے، کچھ تعلیم و تربیت اور ماحول سے اور کچھ اپنی سعی اور ارادے سے مسعود کو پہلی دو شقوں سے زیادہ حصّہ ملا تھا۔ وہ باپ کی طرح بلند و بالا، خوش شکل اور تنومند تھے۔ آواز بھی سیّد محمود سے بہت ملتی تھی خصوصاً جب کبھی وہ گہری اور بلند آواز سے بولتے تھے۔ ایک بار میں ان کے مکان پر

اندر کمرے میں بیٹھا تھا، یہ برآمدے سے گزرے، چونکہ اوپر کا حصہ نظر نہیں آتا تھا صرف ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں مجھے دفعتاً یہ خیال ہوا کہ محمود جا رہے ہیں۔ حافظہ بھی ان کا ایسا ہی قوی تھا جیسا سید محمود کا۔ ایک بار بھی کسی کو دیکھ لیا تو پھر نہیں بھولتے تھے۔ بعض وقت ان کے غیر معمولی حافظے کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ تخمیناً اٹھارہ بیس سال ہوتے ہیں جب میں سر اکبر حیدری لیڈی حیدری اور مسعود میسور کے جنگلوں سے گزر رہے تھے کہ یکبارگی انھوں نے موٹر ٹھیرائی اور ایک شخص کو جو سڑک کی دوسری طرف کھڑا تھا، اشارے سے پاس بلایا اور اس کا نام لے کر اس کا مزاج پوچھا اور دوسرے حالات پوچھے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے جو اس بے تکلفی سے اس کا نام لے کر احوال پوچھ رہا ہے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور کہا تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ اس بیچارے نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو کہا تمھیں یاد نہیں ہم تم اسکول کی فلاں جماعت میں ساتھ پڑھتے تھے۔ میرا نام یہ ہے۔ یہ سن کر اسے اور بھی حیرت ہوئی۔ اور ہم سب نے ان کے حافظے کی داد دی۔ ایک بار جو پڑھ لیتے یا سن لیتے تو عموماً ان کے حافظے میں نقش ہو جاتا تھا۔ حالی صدسالہ جوبلی کی ایک صحبت میں انھوں نے اقبال کے شعر سنانے شروع کیے۔ سر محمد اقبال بھی وہاں موجود تھے، وہ کہنے لگے کہ ان کو میرے اس قدر شعر یاد ہیں کہ خود مجھے بھی یاد نہیں۔ آخر زمانے میں مثنوی مولانا روم کا دور رہتا تھا، شاید یہ بھی اقبال ہی کا اثر تھا۔ یہی کیفیت سید محمود کی تھی کہ ان کے حافظے کا خزانہ معلومات سے مالامال تھا اور حافظ اور خیام کے تو وہ حافظ ہی تھے۔

اگرچہ قوی ہیکل اور بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے لیکن زیادہ جفاکشی اور مشقت کے متحمل نہیں تھے۔ وہ کسی قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ مگر

دوسروں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ یہ سلیقہ میں نے یا تو نواب محسن الملک میں دیکھا یا مسعود میں۔ اُن کے مددگار یا اہل کار خوشی خوشی کام کرتے تھے جیسے کوئی اپنا کام کرتا ہے۔ کام کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے اور انھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔ وہ دوسروں کے کام نکالنے اور فائدہ پہنچانے میں بڑے دلیر تھے۔ لڑ جھگڑ کر خوشامد سے چاپلوسی سے غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اِس طرح اُنھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ ایک تو اُن کی ذاتی وجاہت، دوسرے وہ خوش تقریر ایسے تھے کہ جو کہا منوا لیا۔ اسی وجہ سے اُنھیں حیدرآباد اور علی گڑھ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔

وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے، مصیبت زدوں کی داستان سن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ ایسے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ خود میں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے۔ مشکل کے وقت اُن کے دوست اُنھیں آگھیرتے تھے وہ بلا تامل سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے بعض ایسے دوستوں کو مصیبت اور تباہی سے بچایا جو شاید اس کے مستحق نہ تھے۔ سر محمد اقبال نے ایک موقع پر خوب کہا کہ مسعود نے دماغ باپ کا اور دل دادا کا پایا ہے۔

پہلے وہ سر تھیوڈور ماریسن کی نگرانی میں رہے اس کے بعد انگلستان چلے گئے۔ اِس لیے اُن کی اُردو فارسی کی تعلیم نہ ہو سکی۔ جب وہ حیدرآباد آئے تو یہ کمی محسوس ہوئی اور محض اپنی کوشش اور مطالعے سے ان زبانوں میں خاصی دستگاہ حاصل کر لی۔ اُردو فارسی کے اساتذہ کا کلام بے تکلف

پڑھتے تھے اور اُن کی داد دیتے تھے اور کثرت سے شعر یاد تھے۔ یہاں بھی اُن کے حافظے نے اُن کی یاوری کی۔

نواب عماد الملک بہادر کے انتقال کے بعد انجمن ترقّیٔ اُردو کے صدر مسعود ہی منتخب ہوئے۔ انجمن سے اُنھیں بڑا شغف تھا اور اس پر ان کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے۔ اپنے لوگوں سے تو خیر اُنھوں نے رقمیں وصول کی ہی تھیں، انگریزوں سے بھی چندے لیے اور اُنھیں لائف ممبر بنایا۔ اور صرف ہندوستان ہی کے انگریزوں سے نہیں بلکہ جب وہ انگلستان گئے تو وہاں سے بھی رُپیہ وصول کر کے لائے۔ اور سب سے بڑا کمال یہ کیا کہ سیاحتِ جاپان کے زمانے میں جاپانی جیسی قوم سے جو دُنیا بھر کو لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رہی ہے، انجمن کے لیے چندہ لے کر آئے۔ اب کہ انجمن نے وسیع پیمانے پر کام کرنے کا تہیّہ کیا ہے اُن سے بڑی بڑی توقعات تھیں۔ اُنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد وہ انجمن ہی کے لیے کام کریں گے اور اُس کی مالی حالت کو مستحکم کر کے چھوڑیں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ اس سے پہلے ہی چل بسے۔

اُردو زبان کے بڑے حامی تھے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ میر انیسؔ کے مرثیے انھیں نے مولانا طباطبائی سے مُرتّب کرا کر نظامی پریس بدایوں میں طبع کرائے۔ خود اُردو شعرا کے کلام کا ایک انتخاب "اِنتخابِ زرّیں" کے نام سے طبع کرایا۔

طبیعت میں نفاست پسندی بہت تھی۔ صنّاعی کے دل دادہ تھے۔ اچھّی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خوب کھاتے اور کھلاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے کھلاتا تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اور اس کا بہت بُرا مانتے تھے کہ لوگ

انھیں انگریزی مذاق کا آدمی سمجھتے ہیں۔

اُن کا مزاج اور مذاق کچھ ملا جلا تھا، کچھ ہندی اور کچھ انگریزی۔ لیکن ان دونوں کو انھوں نے ایسے سلیقے سے ملایا تھا کہ خاص نفاست اور حسن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی خالص مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن اکثر وہ ٹھیٹ ہندی تھے اور یار دوستوں سے کھلے ڈلے بے تکلّف رہتے تھے۔ ظرافت، چھیڑ چھاڑ اور شوخی ان کی طبیعت کا جز تھی۔ بعض وقت صبح کو ان کے ہاں جایئے تو کیا دیکھیے گا کہ کُرتا پجامہ پہنے یا دُلائی اوڑھے پلنگ پر پلوتھی مارے بیٹھے ہیں اور اِرد گرد یار دوست کُرسیوں پر موجود ہیں اور گپ شپ ہو رہی ہے اور یہ بیچ میں بیٹھے بلبل ہزار داستان کی طرح چہک رہے ہیں۔ جہاں بیٹھتے یا پہنچ جاتے تو ساری مجلس پر چھا جاتے اور طرح طرح کے لطیفے اور چٹکلے سُناتے اُس وقت سراپا بہار اور گل و گلزار معلوم ہوتے تھے۔ ان باتوں سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی خوش گپ تھے۔

بڑے ذہین اور طبّاع تھے۔ مطالعے کا بہت شوق تھا اور بڑا اچّھا کتب خانہ جمع کیا تھا۔ جو کوئی عمدہ کتاب شائع ہوتی فوراً منگاتے اور پڑھتے۔ جتنا وقت کام سے اور ملنے جُلنے سے بچتا وہ سب مطالعے میں صرف ہوتا۔ انگریزی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ فرانسیسی خوب جانتے تھے اور بلا تکلّف بولتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں زیادہ انگریزی اور فرانسیسی کتابیں تھیں۔ اپنے دوستوں کو بھی مطالعے کی ترغیب دیتے اور بعض اوقات جو کوئی اعلا درجے کی کتاب چھپتی تو اُس کی تعریف کرتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے۔

تعصّب اُن کے مزاج میں نام کو نہ تھا۔ ہر مذہب و ملّت کے لوگ اُن کے دوست تھے اور سب سے یکساں مخلصانہ برتاؤ کرتے تھے اور سب کے کام آتے تھے۔

حال میں جو ہندی اُردو کا قصّہ چھڑا مجھ سے اُنھوں نے خاص طور پر کہا کہ دیکھو اسے فرقہ داری چیز نہ بنانا ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ بھولے سے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے جو کسی فرقے والے کو ناگوار ہو۔

جہاں رہے مقبول خاص وعام رہے۔ ان کی مقبولیت کا عالم کوئی حیدرآباد میں دیکھتا جب یہاں سے جانے کی ٹھن گئی تو دنوں پہلے ان کی دعوتوں کے اوقات مقرر ہوگئے تھے، اس زمانے میں انھیں ایک وقت بھی اپنے گھر کھانا نصیب نہ ہوا اور بہت سے دوست جو اُن کی دعوتیں کرنا چاہتے تھے محروم رہ گئے۔ ٹاؤن ہال میں جب انھیں پبلک کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تو تمام ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر صدر اعظم اور نواب ولی الدولہ بہادر اسٹیج پر اُن سے بغل گیر ہوئے۔ مہاراجہ بہادر نے اُنھیں پرانی صنّاعی کے نفیس تحفے دیے۔ رخصت کے وقت اسٹیشن پر ہجوم کا یہ حال تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی اور اندر باہر تمام اسٹیشن بھرا ہوا تھا اور ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ آدمی جب برسرِ اقتدار ہوتا ہے تو خوشامد میں ہزاروں استقبال اور مشایعت کے لیے آموجود ہوتے ہیں لیکن جب اقتدار و اختیار سے کنارہ کش ہو کر معمولی شخص رہ جائے اور پھر اُسے قبولِ عام حاصل ہو تو سمجھو کہ وہ آدمی ہے۔ یہ مقبولیت یا تو کسی زمانے میں نواب محسن الملک بہادر کو حاصل ہوئی تھی یا اس زمانے میں نواب مسعود جنگ کو۔

افسوس ہماری قوم میں سے ایک ایسا اچھا آدمی اُٹھ گیا۔ زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس سے ہمیں بہت سے کام لینے تھے۔ تاہم اس عمر میں بھی اُس نے ایسے کام کیے جو دوسروں سے نہ ہو سکے۔ گو اس وقت وہ ہم میں نہیں ہے مگر اُس کی یاد ہمارے دلوں میں ہے۔

پنچھی اُڑ گیا پہ ڈالی ابھی تک جھول رہی ہے۔

میرن صاحب

بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے، جو اُن سے چھوا کندن بن گیا۔ ایسے بہت سے ہیں جنھیں لوگ محض اس وجہ سے جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی نسبت سے انھیں کسی بڑے شخص کے نام سے لگاؤ پیدا ہو گیا ہے، گو برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔ یوں وہ کچھ بھی نہ تھے اور نہ کوئی انھیں جانتا اور جس طرح لاکھوں کروڑوں نفوس مر کھپ گئے اور کسی نے پوچھا بھی نہیں یہ بھی یونہیں بے نام و نشان اور گم نام رہ جاتے، لیکن کسی نامور شخص کی نسبت سے وہ مرے بعد بھی زندہ ہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ یہ شخص اس بڑے آدمی کا ہم مذاق بھی ہو، اتنا کافی ہے کہ اُسے کسی نہ کسی عنوان سے اُس سے کوئی تعلق رہا۔ مثلاً اُس کی تصنیف میں کہیں نام آگیا یا اپنے خط میں کہیں ذکر کر دیا، اب لوگ ہیں کہ کھوج لگاتے پھرتے ہیں کہ یہ کون تھا، کہاں کا تھا، کیسا تھا۔ اور تو اور بیچارے نوکروں کی بھی کم بختی آجاتی ہے۔ جہاں کہیں کسی بچے کھچے بوڑھے کھباٹ کا پتا لگا، حضرات سوانح نویس اور مضمون نگار پہنچے اور لگے اُس سے طرح طرح کے ٹیڑھے بینگے سوال کرنے۔ وہ حیران ہے کہ انھیں ہوا کیا ہے اور کہتے کیا ہیں؟ آخر کسی نہ کسی طرح سے کوئی بات اس سے نکال ہی لی اور نمک مرچ لگا کے افسانہ بنا دیا۔ تقدیر کی نیرنگی دیکھیے کہ ہم عصروں کو کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا۔

یوں تو جوں جوں زمانہ بڑھتا جاتا ہے مرزا غالب کے کلام کی قدر بڑھتی جاتی ہے لیکن اُن کے رقعے سب سے زیادہ مقبول ہوئے اور لوگوں نے

ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکالے اور شایع کیے اور اب تک تلاش جاری ہے۔ اب بھی کبھی نہ کبھی اُن کا کوئی غیر مطبوعہ رقعہ نکل ہی آتا ہے۔ ہندوستان کی کوئی یونی ورسٹی ایسی نہیں کہ جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہو اور اُردوئے معلّٰی وہاں کے نصاب میں نہ ہو۔ مرزا صاحب کے رُقعے ہر قسم کے لوگوں کے نام ہیں اور پھر ان میں بہت سے لوگوں کے نام آتے ہیں۔ اب اُستاد شاگرد دونوں کو یہ ٹوہ رہتی ہے کہ یہ لوگ ہیں کون اور مرزا صاحب سے ان کے کیا تعلقات تھے؟ "مولوی" مہیش داس (مولوی فاضل، لکچرار ہندو یونی ورسٹی بنارس بڑے شوق اور انہماک سے مرزا صاحب کے اصلی اور نقلی خط جمع کر رہے ہیں، مطبوعہ خطوط کی صحت بھی کرتے جاتے ہیں، ترتیب بھی دُرست کر رہے ہیں اور جو خط اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی میں نہیں اُن کا بھی اضافہ کرنے والے ہیں۔ جن جن لوگوں کے نام خط ہیں یا جن جن کا نام خطوں میں آیا ہے اُن کے حالات بھی برابر تلاش کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں اُنھوں نے مجھ سے بھی بعض صاحبوں کے حالات لکھ کر پوچھے، اس فہرست میں "میرن صاحب" کا بھی نام تھا۔ میرن صاحب سے بے شک میری ملاقات تھی مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ مجھ سے اُن کے حالات پوچھیں گے، ورنہ میں اُن سے کُرید کُرید کے ایک ایک بات پوچھتا اور حضرت مہیش کے نذر کرتا۔ اب جو کچھ مجھے معلوم ہے یا یاد رہ گیا ہے وہ لکھے دیتا ہوں۔

میرن صاحب سیّد تھے اور دِلّی کے روڑے تھے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور ایک شاہ زادے نے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور بیٹوں کی طرح پالا۔ قلعۂ معلّٰی کا نام بڑا تھا، لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت و عزت بھی بہت تھی، لیکن اس کے رہنے والے سب کچھ کھو چکے تھے اور آنے والی

گھڑی سے بے خبر عیش و آرام اور لہو و لعب میں مصروف تھے۔ پتنگ بازی، مُرغ بازی، کشتی، گانا، بجانا، کیا تھا جو وہاں نہ تھا۔ میرن صاحب کا لڑکپن اور اُٹھتی جوانی اسی عالم میں بسر ہوئی۔ گانے بجانے سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت تھی، اسی میں لگ گئے اور اُس وقت کے اچھے اچھے اُستادوں سے فیض حاصل کیا۔ چوں کہ تھوڑا بہت مذہبی لگاؤ بھی تھا، سوزخوانی میں خوب کمال حاصل کیا۔ اتنے میں سنہ ۵۷ کا ہنگامہ برپا ہوا جس نے سارے کھیل بگاڑ دیے۔ ہنگامہ کیا تھا چھوٹی موٹی قیامت کا سماں تھا۔ سارے شہر میں بھاگڑ مچ گئی، سینکڑوں گولی کا نشانہ بنے، صدہا سولی پر چڑھا دیے گئے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ عورتیں، بچّے، بوڑھے، جوان گرتے پڑتے جان بچا کر بھاگے۔ کچھ گوروں کے ہاتھوں مارے گئے اور کچھ کالوں کے ہاتھوں، جو بچے وہ خاک بسر چھپ چھپا کر یا بھیس بدل کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ قصبات اور دیہات میں جن کے کوئی عزیز و اقارب یا دوست آشنا تھے وہ ان کے ہاں جا چھپے۔ میرن صاحب بھی بھاگ کر پانی پت پہنچے۔ میر مجروح بھی دِلّی چھوڑ کر وہیں پہنچے۔

ان خانماں برباددوں کا اب کوئی پوچھنے والا نہ تھا، ایسا کوئی ہنر یا پیشہ آتا نہ تھا کہ اپنا اور بال بچّوں کا پیٹ پال سکیں۔ اُن کے ہنر یا کمال کی قدر امیر امرا کرتے یا بادشاہ۔ اِس لیے اُن کی نظریں دیسی ریاستوں کی طرف پہنچیں۔ رام پور میں نواب کلب علی خاں اور الور کے راجا شیو دان سنگھ اہلِ کمال کے بڑے قدر دان تھے۔ دِلّی کے اکثر باکمالوں نے اُدھر ہی کا رُخ کیا اور یہی دو ریاستیں دِلّی کے قریب بھی تھیں۔ میرن صاحب اور میر مجروح الور پہنچے اور مہاراجہ نے اُن کی قدر فرمائی۔ میر مجروح کے قصیدے مہاراجا کی شان میں موجود ہیں۔ مہاراجا فارسی، اُردو کی بڑی اچھی استعداد رکھتے تھے

اور شعرا اور اہلِ علم کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کچھ دنوں الور میں انھوں نے عزت اور آسائش سے بسر کی لیکن جب مہاراجا کے اختیارات سلب ہوگئے تو کوئی قدرداں نہ رہا اور انھیں الور چھوڑنا پڑا۔ کچھ عرصے میرن صاحب کا تعلق ریاست پٹودی سے بھی رہا وہاں وہ نواب کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ وہاں سے قطع تعلق ہوا تو پھر اپنی دلّی میں آگئے۔ یہاں نواب احمد سعید خاں طالب (خلف نواب ضیاء الدین نیّر) جب تک زندہ رہے اُن سے سلوک کرتے رہتے۔ یہ بھی ایک قسم کی مصاحبت تھی۔ میرن صاحب اُن کا کچھ کام کاج بھی کر دیتے تھے۔

میرن صاحب کا آنا حیدر آباد بھی ہوا۔ غالباً ننّھے خاں صاحب یعنے کرم اللہ خاں صاحب مرحوم نے اُنھیں مولوی سیّد علی حسن صاحب سے ملایا۔ ننّھے خاں صاحب دِلّی کے معززین میں سے تھے، بڑے باوضع اور بامروّت اور قدیم وضع اور اخلاق کے مکمّل نمونہ تھے۔ مولوی سیّد علی حسن نواب محسن الملک کے چچا زاد بھائی تھے اور اُس زمانے میں فنانشل سکریٹری تھے۔ سیّد صاحب اگرچہ دیر آشنا تھے مگر نہایت باوضع دوستی کے پکّے اور بڑے صادق القول شخص تھے۔ اُنھوں نے میرن صاحب کو نواب وقارالامرا کی خدمت میں جو ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم تھے، پیش کیا۔ نواب صاحب مرحوم کی فیّاضی اور داد و دہش اب تک ضرب المثل ہے، مل کر اپنی قیام گاہ پر واپس آئے تھے کہ نواب صاحب کا آدمی میرن صاحب کے لیے پانسو ڑپے لے کر حاضر ہوا۔ جب تک نواب صاحب زندہ رہے یہ پانسو ہر سال اُنھیں ملتے رہے۔ میرن صاحب بھی جب تک سیّد علی حسن صاحب زندہ رہے سال میں ایک پھیرا حیدر آباد کا ضرور کر جاتے تھے۔ سیّد صاحب اُن کی بہت قدر کرتے تھے

اور اُن کے آنے سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ آخری بار میرن صاحب حیدرآباد مولانا حالی کے ساتھ اُس وقت آئے جب کہ مولانا کو مرحوم نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہِ سادس کی جوبلی کی تقریب میں دعوت دی گئی تھی اور اُن سے نظام مرحوم کی سوانح عمری لکھوانے کا خیال تھا۔ مولانا حالی بھی میرن صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ ان کی فلاح اور بہبودی کی فکر میں رہتے تھے۔

میرن صاحب جوانی میں ضرور حسین ہوں گے۔ میں نے اُنھیں بڑھاپے میں دیکھا، اس وقت بھی ان میں ایک آن پائی جاتی تھی۔ میانہ قد، سُرخ و سفید رنگ، آنکھیں کسی قدر بڑی بڑی، سفید ڈاڑھی پوری تو نہیں کسی قدر چڑھی ہوئی، گول چہرہ، ہونٹ نہ موٹے نہ پتلے، پیشانی چوڑی۔ مرزا صاحب میر مجروح کے خطوں میں میرن صاحب کے چھیڑنے کے لیے اُن کے حُسن کا ذکر بڑے مزے سے کرتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں پوچھتے ہیں کہ "میرن صاحب کو میرا خط پہنچا یا نہ پہنچا۔۔۔۔۔ پس اگر جیسا کہ گمان ہے خط نہیں پہنچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہنچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا اور اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے۔ حُسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "ایک غریب سیّدِ مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے تم کو سرمایۂ آرایشِ گفتار بہم پہنچا ہے۔"

میرن صاحب کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "تمھارا خط پہنچا، اگرچہ میں نے صرف پڑھا، میر مہدی کے جلانے کو لکھتا ہوں کہ میں نے آنکھوں سے لگایا۔" ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میاں کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو۔

چشمِ بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے۔ تمھارا منہ چشمِ بیمار کے لائق کہاں؟ چشمِ بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں جس کو اچھّے اچھّے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار چشمِ بیمار کو کیا جانو۔"

مرزا صاحب میرن صاحب اور میر مجرُوح کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ میر مجرُوح کو جو خط لکھے ہیں اُن سے کیسی محبّت اور شفقت ٹپکتی ہے۔ پھر مرزا صاحب کا طرزِ تحریر، سبحان اللہ موتی پروئے ہیں۔ یہ خط ملاحظہ کیجئے۔

"اے جناب میرن صاحب اسلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں، میں نے یہ تو عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار جاتا رہا ہے، صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی، میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لکھ دیتا ہوں آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اُس کے خط کو آئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں تو باز رکھتا ہے۔ اچھّا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سُنتا اور حظ اُٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو! ہوش کی خبر لو! تمھارے جانے سے مجھے کیا علاقہ، میں بوڑھا آدمی

بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا لاحول ولاقوۃ۔"

یہ خط میر مجروح کے نام ہے اور خط لکھتے وقت میرن صاحب موجود ہیں۔

ایک دوسرے خط میں میر صاحب کی صحت یابی کی خبر سننے پر بھی چھیڑ نکالی ہے اور کس حسن سے اسے بیان کیا ہے۔ "بھئی میں تم سے بہت آزردہ ہوں، میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت نہ مجھ کو تہنیت بلکہ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے ہیں جیسے آگے تھے، اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کہ ہے ہے کیا غضب ہوا، یہ کیوں اچھے ہو گئے یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں:۔

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانیں   دلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر کا مقطع یوں ہے:۔

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں   اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

میر کی جگہ میرن اور رہا کی جگہ بچا کیا اچھا تصرف ہے۔

غرض اس قسم کی محبت و لطف کی باتیں بہت سی ہیں کہاں تک لکھوں، مرزا صاحب کے خط موجود ہیں۔ لیکن میر صاحب کو بھی مرزا صاحب سے عشق تھا۔ شاید کسی مرید کو اپنے مرشد سے ایسی عقیدت اور ارادت نہ ہو گی جیسی میرن صاحب کو مرزا صاحب سے تھی۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ حیدر آباد کے ایک وکیل کسی سے ذکر کر رہے تھے کہ مرزا غالب شراب پیتے تھے۔ میر صاحب قریب کے کمرے میں کپڑے بدل رہے تھے۔ ان کے کان میں اس کی بھنک جا پڑی، ویسے ہی باہر نکل آئے۔ وکیل صاحب پر بہت بگڑے اور بہت برا بھلا کہا۔ جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو میں نے پوچھا

توکیا یہ غلط ہو کہ مرزا صاحب شراب پیتے تھے۔ کہنے لگے یہ لوگ کیا جانیں، یوں ہی جو جی میں آیا بک دیتے ہیں۔ اب اُنھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ کس طرح پاک صاف ستھرے آب خورے میں تھوڑی سی ڈالی جاتی اور اس میں گلاب ملایا جاتا اور اس پر صافی لپیٹ کر اُدھر ہوا میں لٹکا دیا جاتا۔ رات کے وقت جب کوئی نہیں ہوتا تھا اور صرف میں یا میر مجروح ہوتے تو اس وقت اسے پیتے۔ اس کے بعد توبہ استغفار کرتے۔ غرض اُنھوں نے مرزا صاحب کی مے نوشی کو طُول دے کر ایسے عجیب طور سے بیان کیا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شراب نہ تھی بلکہ آبِ کوثر تھا۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے اُن کے سامنے مرزا صاحب کا ایک شعر پڑھا۔ اس میں کوئی لفظ بدل گیا تھا۔ سُن کر فرمانے لگے: "مرزا صاحب کا شعر غلط نہیں پڑھنا چاہیے، گُناہ ہوتا ہو۔ یہ آیت حدیث نہیں جیسا چاہا پڑھ دیا۔" عقیدت کی اِنتہا ہوگئی۔

ایک بار کسی نے مرزا صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

بنا ہو شہ کا مصاحب پھرے ہو اِتراتا
دگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہو

کہنے لگے وہ کبھی نہیں اِتراتے تھے۔ یہ جُملہ اُنھوں نے کچھ ایسے لہجے اور ایسی صوُرت بنا کر کہا کہ سُننے والے بھی اس سے متاثر ہوگئے۔ وہ جب کبھی مرزا صاحب کا ذکر کرتے تو اُن کے چہرے اور دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی تھی۔

ایک صاحب سیّد محمد حسین اغلَب موہانی تھے۔ وہ کسی زمانے میں اودھ اخبار میں کام کر چکے تھے اور شاید کوہِ نور لاہور کے اڈیٹر بھی رہے تھے۔ سیاسی معاملات سے خاص دِل چسپی تھی۔ افغان، روس اور اِسی قسم کی

دو ایک کتابیں بھی اُن کی تصنیف سے تھیں جن کی اُس زمانے میں بہت تعریف ہوئی تھی۔ وہ اکثر حیدر آباد میں آتے رہتے تھے۔ شعر کہنا تو درکنار شاعری سے مطلق مس نہ تھی۔ غالباً اسی وجہ سے لوگ اُنھیں دل لگی میں اغلب کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے یہ لفظ ان کے نام کا جزو ہوگیا۔ میرن صاحب ملّا محمد علی مرحوم کے ہاں مقیم تھے جہاں اکثر دوست احباب کا مجمع رہتا تھا۔ ایک دن اغلب صاحب وہاں پہنچے۔ کسی نے اُن کا تعارف میرن صاحب سے بھی کرایا۔ نام سُن کر بہت چونکے اور بگڑے کہ "ہیں! یہ غالب سے بھی بڑھ گیا" اور یہ کہہ کر مُنہ پھیر لیا اور پھر کبھی اُن سے سیدھے مُنہ بات نہ کی۔

میر صاحب اگرچہ غریب آدمی تھے مگر بڑے مہماں نواز تھے۔ جب کبھی دہلی جانا ہوتا تو بغیر دعوت کیے اور کھانا کھلائے نہیں چھوڑتے تھے۔ کھانا بہت مزے کا اور سلیقہ کا ہوتا تھا۔

ایک بار دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میاں منظور بھی (جواب نواب منظور جنگ بہادر ہیں) میرے ساتھ تھے۔ ہم میر صاحب سے بھی ملنے گئے۔ سردی کا موسم تھا اور دن نکل آیا تھا۔ میر صاحب بڑے تپاک سے ملے اور ہمارے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ دروازے کے سامنے گلی میں مونڈھے لاکر بچھا دیے۔ چائے پینے کے لیے کہا۔ ہم نے ہر چند کہا کہ ہم چائے پی کر اور ناشتہ کرکے آئے ہیں مگر وہ نہ مانے۔ اُٹھے اور گھر میں سے برتن لے کر بازار دُودھ لینے چلے۔ بہت بڈھے ہوگئے تھے اور ہمیں یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ اس حالت میں خواہ مخواہ ہمارے لیے تکلیف کریں۔ ہم نے پھر عرض کیا کہ میر صاحب آپ تکلیف نہ فرمایئے، چائے کی ضرورت نہیں ہے مگر اُنھوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ واپس آئے تو ہم نے دیکھا کہ ماتھے پر چوٹ کے نشان ہیں

اور کچھ خون نکل رہا ہے۔ ہم نے گھبرا کر پوچھا میر صاحب یہ کیا ہوا۔ کہنے لگے بھئی ٹھوکر لگی اور میں گر پڑا۔ تم اس کا کچھ خیال نہ کرو، میں تو بازار سے اپنا سودا خود ہی لاتا ہوں۔ ہمیں اس کا بڑا افسوس ہوا۔ چند منٹ کے بعد دو بڑے بڑے جنگی بادیے چائے سے بھرے ہوئے سامنے لا کر رکھ دیے اور فرمایا لو پیو۔ بادیوں کی صورت دیکھ کر میں بہت سٹ پٹایا کہ یہ قدحے کیوں کر پیے جائیں گے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ تھوڑی سی پی کر چھوڑ دیں۔ میاں منظور بہت ذہین ہیں وہ فوراً سمجھ گئے اور انھوں نے میر صاحب سے کہا کہ حضرت ذرا اندر سے پان تو لا دیجیے۔ میر صاحب اندر گئے اور انھوں نے جھٹ دونوں بادیے نالی میں انڈیل دیے۔ سردی کا تھا موسم وہ چائے وہیں جم کے رہ گئی۔ اب میں بہت پریشان ہوا کہ میر صاحب دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ میاں منظور فوراً دوڑے ہوئے گئے اور ایک بہشتی کو ساتھ لائے۔ اس نے پوری مشک نالی میں بہا دی۔ تب جان میں جان آئی۔ میر صاحب باہر آئے تو بادیے خالی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اور لاؤں ہم نے کہا کہ حضرت بس، یہی بڑی مشکل سے پی ہے۔

میر صاحب کے دوست احباب جو دلّی سے باہر رہتے تھے، جب انھیں کوئی چیز دلّی سے منگانی ہوتی تو وہ اُن سے فرمایش کر بھیجتے تھے وہ ایک ایک دُکان پھرتے، گھنٹوں لڑتے جھگڑتے اور اچھّی سے اچھّی چیز سستے سے سستے داموں میں خرید کر بھیجتے۔ جب کبھی اُن کے ساتھ کسی چیز کے خریدنے کا اتفاق ہوا تو دُکان دار سے سودا چکاتے اور جھگڑتے دیکھ کر بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔ جب میں کہتا کہ حضرت اب جانے دیجیے اور لے بھی لیجیے تو بہت خفا ہوتے اور کہتے تم سودا خریدنا کیا جانو، تم ہی جیسے لوگوں نے تو دُکان داروں کا دماغ خراب

کردیا ہے۔ دلّی میں بہت سے پیشہ ور پنجابی اور سکھ آ گئے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ میر صاحب رستہ چلتے ان لوگوں کو دیکھ کر بہت بگڑتے تھے اور ڈانٹتے تھے۔ میں سمجھاتا کہ میر صاحب آپ یہ کیا کرتے ہیں خواہ مخواہ کسی سے لڑائی ہو جائے گی مگر وہ نہیں مانتے تھے۔

جوانی کے زمانے میں ان کی سوز خوانی کی بہت دھوم تھی۔ بڑھاپے میں بالکل ترک کردی تھی۔ البتہ جب کبھی وہ حیدر آباد آتے تو اپنے مربّی اور قدردان مولوی سیّد علی حسن صاحب کو کبھی کبھی سوز سُناتے تھے۔ اس صحبت میں صرف دو چار احباب ہوتے تھے۔ اگرچہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی مگر اُن کے پڑھنے کا بڑا اچھا ڈھنگ تھا اور آواز میں اس وقت بھی درد پایا جاتا تھا۔ اُن کا پڑھنا آج کل کے مشہور سوز خوانوں کا سا نہ تھا جو سوز خوانی نہیں کرتے بلکہ اپنا کمالِ موسیقی دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ اِس بات کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اُستادوں نے سوز خوانی کے ڈھنگ کو عام گانے سے کسی قدر الگ کر کے ایسا رکھا ہے کہ اس سے سوز و گداز کا خاص رنگ پیدا ہو جاتا ہے، آج کل کے باکمال اس کا خیال نہیں کرتے گلے بازی پر اُتر آتے ہیں۔ پہلے کا حال تو مجھے معلوم نہیں سب ہی کچھ کیا ہوگا، جس زمانے کا ذکر میں کر رہا ہوں، وہ سوائے سوز خوانی کے، وہ بھی کبھی کبھی اور خاص خاص صحبتوں میں، کبھی عشقیہ نظمیں یا غزلیں نہیں پڑھتے تھے۔ ایک بار میرے اصرار پر رات کے وقت جب سب سو گئے تو اُنھوں نے مرزا غالب کی ایک غزل گا کر سُنائی، جس کا مطلع یہ ہے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

میرن صاحب باتیں مزہ لے لے کر اور ٹھیر ٹھیر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے

مزاج میں نہ تھی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ شاید غدر میں بھاگتے وقت اس کی ضرورت پڑی ہو تو پڑی ہو ورنہ یوں عام طور پر زندگی کے کاروبار میں انھیں اس "شیطانی حرکت" یعنی تعجیل سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ ایک روز میر صاحب کہیں باہر سے آئے، میں شامت کا مارا اُن سے پوچھ بیٹھا کہ میر صاحب آپ کہاں گئے تھے؟ کہنے لگے، "بھئی آج آنکھ ذرا سویرے کھل گئی، چمن میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا پھر ضروریات سے فارغ ہو کر منہ ہاتھ دھویا، کپڑے پہنے، اتنے میں میاں عادل آ گئے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا کہ میر صاحب میں نے تو یہ پوچھا تھا کہ آپ آج صبح صبح کہاں تشریف لے گئے تھے؟ فرمانے لگے، "کہہ تو رہا ہوں۔" اب اُنھوں نے وہیں سے بات شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنے میں میاں عادل آ گئے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کڑے مانک پور کے رہنے والے ہیں، میں انھیں حیدر آبادی سمجھا تھا۔ اُن کا سارا کنبہ یہیں ہے۔ اُنھوں نے یہاں کے پرانے قصے بڑے مزے مزے کے بیان کیے......" اب مجھے اُلجھن ہونے لگی اور میں نے قطع کلام کر کے کہا کہ "حضرت میں یہ نہیں پوچھتا، میں نے تو آپ سے صرف اتنا دریافت کیا تھا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے۔ یہ آپ نے کیا قصہ چھیڑ دیا؟" کہنے لگے میں تو یونہیں کہوں گا، تمھیں سننا ہے تو سنو! نہیں تو جانے دو۔" اُس وقت معلوم ہوا کہ نئے اور پرانے لوگوں میں کیا فرق ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے وقت کے مالک تھے اور ہم وقت کے تابع۔ وہ ابھی تک اسی عالم میں تھے جس میں اُنھوں نے اپنا لڑکپن بسر کیا تھا۔ زمانے کے زبردست ہاتھ نے اُنھیں جھنجھوڑا تو تھا مگر اُن کے خیالات اور جذبات پر بہت کم اثر کیا تھا۔ لیکن آج جو نئے ہیں وہ کل پرانے ہو جائیں گے اور یہ کش مکش جو صدہا سال سے یونہیں جاری ہے

یونہیں جاری رہے گی۔"

میر صاحب ٹھیٹ دلّی کی زبان بولتے تھے اور جہاں کسی کی زبان سے کوئی غلط لفظ یا محاورہ نکلا تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ اگرچہ اُن کا آنا جانا مختلف مقامات میں رہا مگر کہیں کی بولی اُنھیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ ایک بات میں نے اُن میں عجیب دیکھی اور غالباً یہ اکثر پُرانے لوگوں میں پائی جاتی تھی، کہ گو انگریزی لفظ ہماری زبان میں بہت سے آگئے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ تو آدھی اُردو اور آدھی انگریزی بولتے ہیں مگر میر صاحب کی زبان پر کوئی انگریزی لفظ چڑھتا ہی نہ تھا۔ میں نے بہتیری کوشش کی۔ کسی انگریزی لفظ کو صحیح طور سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ بعض وقت بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ مرزا صاحب نے ایک انگریزی لفظ "پفلٹ" لکھا ہے۔ اُن کی مُراد پمفلٹ سے تھی جو مرزا صاحب نے اپنے رقعوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اُنھیں یاد نہیں رہا کہ اُنھوں نے کئی انگریزی لفظ لکھے ہیں اور خاص کر کئی مغربی شرابوں کے نام۔

خیر یہ تو معمولی باتیں تھیں جو میں نے لکھی ہیں لیکن ایک بات ان کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ غدر کے ہنگامے میں اُن کے اُستاد لاپتا ہو گئے یا مارے گئے تھے۔ اُنھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی تھیں جو بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ میر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو ڈھونڈ کر اپنے گھر لے آئے اور اپنی بیٹیوں کی طرح اُنھیں پالا پوسا اور ایسی محبت اور شفقت کی کہ وہ باپ کو بھول گئیں۔ اُن کی اپنی بھی ایک بیٹی تھی جس کی شادی سیّد عبدالرؤف بیرسٹر مرحوم سے ہوئی لیکن اِس کا اُنھوں نے کبھی خیال بھی نہ کیا۔ وہ اِن لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں سمجھتے تھے اور وہ بھی میر صاحب کو سچ مچ اپنا باپ ہی سمجھتی تھیں۔ جو لوگ اِس راز سے واقف نہ تھے وہ ان لڑکیوں کو میر صاحب کی بیٹیاں

ہی خیال کرتے تھے۔ میر صاحب نے ان کی بیٹیوں کی طرح پرورش کی، پڑھایا لکھایا اور شادیاں کیں اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا۔ جو کچھ کماتے وہ اُن کے سامنے لاکر رکھ دیتے تھے۔ انھیں کیا پڑی تھی کہ دِلّی چھوڑ کے مارے مارے پھرتے لیکن محض اُن لڑکیوں کی خاطر وہ زمین کے گز بنے ہوئے تھے۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اُٹھاتے لیکن ان پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے۔ جو کچھ کہیں سے ملتا وہ اُن کو لاکر دیتے تھے۔ انھیں ہر وقت اِن کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان لڑکیوں کو خوش رکھیں اور جس طرح بن پڑے اُن کی خدمت کریں۔ حق شاگردی شاید کسی نے اِس طرح ادا کیا ہو۔ یہ وضع داری یہ محبّت وشفقت اور ایثار اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر دوسروں کی خدمت کرنا ہی جوہرِ انسانیت ہے۔ مولانا حالی نے ایک خط میں بہت سچ لکھا ہے کہ "اگر کسی کو مروّت و محبّت کی زندہ تصویر دیکھنی ہو تو وہ میرن صاحب کو دیکھے۔"

(رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۶ء)

نام دیو ـــــ مالی

نام دیو مقبرۂ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن)، کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی نیکی حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں ؎

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اُس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اُس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مُڑ مُڑ کر دیکھا۔ پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مُسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام

اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دل چسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اُسے دیکھا کرتا۔ مگر اُسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اُس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا۔ اور اولاد کی طرح اُن کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ اُن کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچّوں کو دیکھ خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، اُن کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُن سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اُس کا دِل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہم درد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچا لیتا۔ اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اُسے چین نہ آتا۔ اُس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی خاص کر بچّوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دوُر دوُر سے لوگ اُس کے پاس بچّوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے اُن کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گانو والے بھی اُسے علاج کے لیے بُلا لے جاتے۔ بلا تامّل چلا جاتا مفت علاج کرتا اور کبھی

کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا اِس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے دُرست، سنچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سُننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستایش کی تمنّا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مُرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اُٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور اُنھیں پینے کو پانی مشکل سے میسّر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلّت اور بڑھی تو اُس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔

پانی کیا تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اِس بے مثل کارگزاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اُس نے لینے سے اِنکار کر دیا۔ شاید اُس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب وہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظمِ تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرۂ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا، آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے۔ اُسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی، اور مالی بھی کیسے کیسے۔ ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ اُن کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اُس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اُس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے

سچّا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اُس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اُسی کا کام تھا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا، یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اُس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلّڑ اُس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اُسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مُسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جُھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اِس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اِسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچّھا سمجھتا اور سب سے محبّت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اُسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام

کررہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے اُس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کُندن ہوجاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پرتال ہوگی خدا یہ نہیں پوُچھے گا کہ توُ نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوُچھے گا تو یہ پوُچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اُس سے کام لینے میں توُ نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اُس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

سرسیّد احمد خاں

تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اُس کے خط و خال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صنّاع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دُنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کیے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُن میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کیے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ اُن میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور اُلجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدّت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

سرسیّد احمد خاں ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں۔ اُن کی وفات کو اس وقت پچاس سال سے اوپر ہوتے ہیں اور اگر اُن کے

ملکی یا قومی کام کی مدت کو بھی جوڑ لیا جائے (جو آثار الصنادید کی تصنیف سے شروع ہوتی ہے) تو ایک صدی ہوتی ہے۔ اب نہ وہ عقیدت مند ہی رہے جو اُن کی ہر بات پر آمنّا وصدقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف جو اُن کے ہر کام کو ریاکاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ اس لئے بے لاگ مورخ کے لیے موقع ہے کہ وہ اُس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر اُن کی زندگی اور اُن کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔ میں نے اس نیت سے قلم نہیں اُٹھایا۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں۔ لیکن چونکہ مجھے کئی سال تک اُن کو پاس سے دیکھنے اور اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لیے میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے اُنھیں کیسا پایا اور وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔

سرسید نے اصلاح کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور مسلمانوں پر افسردگی اور مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے توہمات، تعصبات اور اختلافات میں مبتلا تھے۔ اُنھوں نے اُس کے دُکھتے ہوئے پھوڑے اس طرح چھیڑے کہ لوگ بلبلا اُٹھے اور آمادۂ پیکار ہو گئے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اُن کی نظر سے نہ بچا۔ ایک ایک پر تنقیدی نظر ڈالی۔ کھرے کھوٹے کو پرکھا اور بلا خوف لائم بڑی اخلاقی جرأت، دلیری اور بےباکی سے وہ بات کہہ دی اور لکھ دی جسے وہ سچ سمجھتے تھے اس پر بڑا شور غل مچا اخباروں میں لے دے ہوئی۔ خاص کر اودھ پنچ میں اُن کے خیالات مسخ کر کے بڑی بھیانک صورت میں پیش کیے گئے اور اُن کی ہنسی اُڑائی گئی۔ کافر، ملحد، لا مذہب، دجّال، کرشتان کے خطاب دیے گئے اور

کفر کے فتوے لکھے گئے۔ ان مخالفتوں سے کبھی اُن کے دل پر میل نہ آیا بلکہ اُس سے اُن کے کام میں اور گرمی اور جوش پیدا ہو گیا۔ بعض اوقات وہ بے جا اعتراضوں اور تہمتوں کا جواب بھی لکھتے۔ ان جوابوں میں اُن کی انشا پردازی اور ظرافت کا رنگ بہت دلاویز نظر آتا ہے۔ مثلاً:-

مولوی علی بخش سب آرڈی نیٹ جج گورکھ پور اور مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور سرسید کے شدید مخالفوں میں تھے جو اُن کے ہر کام اور ہر بات کو سخت بدگمانی اور نفرت سے دیکھتے تھے۔ اِن بزرگوں نے سرسیدؒ کی تحریروں اور خیالات کے رد میں رسالے لکھے، اخبار جاری کرائے اور عجیب عجیب الزام اور بہتان لگائے۔ مولوی علی بخش نے اسی نوعیت کی ایک کتاب تائید الاسلام لکھی۔ جس کے جواب میں سرسیدؒ نے ایک مضمون دافع البہتان لکھا۔ جس کا آخری فقرہ یہ ہے۔ "جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سیّد الحاج نے کیوں ایسے سخت اور محض بہتان مجھ پر کیے ہیں۔ بہ ظاہر اس کا سبب .... یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیّد الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جاویں گے جیسے کہ بعض آدمی جب مُسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مُسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا، مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں گے اور شبلی و جنید کے مرتبے پر آپ پہنچ گئے ہوں گے مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک

میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہو سکتے۔ پس مقتضائے ایمان داری یہ ہے کہ حج دیرِ احمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روزِ جزا اپنے کرتوتوں کا مزہ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو مولوی امداد العلی نے سرسیدؔ کو اپنا چھپا ہوا ایک رسالہ بھیجا جس میں مفتی سعداللہ صاحب کے "فتوائے تکفیر جناب سید احمد خاں" کی دھمکی دی تھی اور لکھا تھا کہ یہ فتوا راقم کے پاس موجود ہے۔ معلوم نہیں سید احمد خاں کے حوارین اس فتوے پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں۔ سرسیدؔ تہذیب الاخلاق میں اس دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں۔ "پہلے تو ہم گھبرا گئے کہ یہ مفتی سعداللہ کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دِلّی میں دیکھا ہے اور یہ وہی مفتی سعداللہ صاحب ہیں، جنھوں نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آل رسول ابن علی اولادِ نبی کے کفر اور قتل کا فتویٰ دے کر عشرۂ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑھی سے نیزے پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا' تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اور سمجھے کہ آل رسولؐ کے قتل و کفر کا فتوا دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے۔"

زندہ دلی اُن کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور واقعات اُن پر ہجوم کر کے ٹوٹ پڑتے تھے لیکن اُن کی زندہ دِلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض ہم عمر بے تکلف دوستوں سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے، بلکہ چھوٹوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی اُن کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔

مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) ایک بار اُن کے ہاں

جہان تھے۔ ایک روز وہ اپنے کمرے سے کُرتا پاجامہ پہنے سید صاحب کے بڑے کمرے میں آ گئے جہاں وہ بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ مولوی مشتاق حسین کی توند ذرا بڑھی ہوئی تھی۔ پاجامہ کھسک کھسک جاتا تھا اور وہ بار بار ہاتھ سے اوپر چڑھاتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے جو دیکھا تو کہنے لگے "میاں مشتاق حسین تمھارا پاجامہ ہمیشہ کھونٹی پر ٹنگا رہتا ہے"۔ بعض وقات وہ لڑکوں کی سی شرارتیں کر بیٹھتے تھے جو باتوں سے بڑھ کر عمل تک پہنچ جاتی تھیں۔ میں اگر انہیں لکھوں تو شاید بعض سنجیدہ مزاج حضرات ناک بھوں چڑھائیں۔ اس قسم کی حرکتیں زیادہ تر مولوی سید زین العابدین خاں سے ہوتی تھیں۔ جو سید صاحب سے بڑی عقیدت اور خلوص رکھتے تھے اور محض اُن کی محبت کی وجہ سے پنشن کے بعد علی گڑھ میں آ بسے تھے۔ اُن کا بنگلہ سید صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی تھا۔

ایک روز شب کے کھانے میں سید صاحب کے علاوہ زین العابدین خاں سید محمود اور دو ایک اور صاحب شریک تھے۔ کھانا شروع ہو گیا تھا کہ اتنے میں زین العابدین خاں صاحب کا ملازم ایک خوان لیے ہوئے آیا۔ سید صاحب نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ دیکھیں بھئی کیا ہے۔ خوان پوش اُٹھا کر پیالے اور قابیں اُٹھا اُٹھا کر تڑا تڑ پھینکنی شروع کیں۔ زین العابدین صاحب نے کرسی پر سے اُٹھ کر غل مچانا شروع کیا ہائیں ہائیں کیا کرتے ہو۔ وہ ہائیں ہائیں کرتے رہے اور ادھر سب پیالے اور قابیں شہید ہو گئیں۔ کہنے لگے نامعقول ہماری میز پر اپنے گھر سے کھانا منگاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک صاحب کا ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اُن کا اصلی نام تو سعید احمد خاں تھا، لیکن کالج میں وہ گرلمہ کپتان کے نام سے

مشہور تھے۔ یہ عجیب بزرگ تھے۔ اپنے لباس، رفتار و گفتار میں سب سے نرالے۔ کالج کے تعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔ کالج کا کوئی انجینئر نہ تھا انجینئر، نقشہ نویس، افسر پیمایش خود سید صاحب ہی تھے۔ اُن کی ہدایت کے مطابق خاں صاحب کام کی نگرانی کرتے تھے۔ سید صاحب ہر روز شام کو آتے اور دن بھر کے کام کا جائزہ لیتے۔ جہاں کوئی غلطی ہوتی اُس کی اصلاح کرتے۔ خاں صاحب کو تصوّف سے بھی لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کے کمروں میں بھی آجاتے اور اپنے اقوال سے مستفید فرماتے اور صوفیانہ دُہرے وغیرہ سُناتے۔ علاوہ اور خصوصیتوں کے ایک بڑی خصوصیت اُن میں یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے۔ گالی اُن کا تکیہ کلام تھا۔ بیچارے مزدوروں پر اُس کی خوب مشق ہوتی تھی۔ اس میں نئی نئی ایجادیں بھی کرتے تھے۔ لیکن اُن کو کبھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ سچ مچ گالیاں دے رہے ہیں۔ یہ اُن کے لیے معمولی سی بات تھی۔ ایک روز کچّی بارک کے کونے والے مکان میں خاں صاحب چارپائی پر لیٹے تھے۔ ایک طرف میر ولایت حسین صاحب بیٹھے تھے، دوسری طرف میں تھا۔ اتنے میں گوالا آیا جو کالج کی گایوں کا رکھوالا تھا۔ خاں صاحب نے اُسے کسی بات پر اپنی زبان میں ڈانٹنا شروع کیا۔ گوالا نے کہا خاں صاحب گالیاں تو نہ دیجئے۔ خاں صاحب نے میر صاحب کی طرف پلٹ کر کہا۔ دیکھا میر صاحب میں نے اس مادر.......... کو کب کوئی گالی دی ہے۔ یہ حرام زادہ .... خواہ مخواہ مجھ پر تہمت دھرتا ہے۔ میں مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ خاں صاحب کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ انھوں نے کوئی گالی دی ہے۔ سید صاحب اُن کو اکثر چھیڑتے رہتے تھے۔ یہ بھی اُن سے اکثر بے تکے سوال کرتے اور وہ بھی اُن کو بے تکے جواب دیتے

جو بہت ہنسی کے قابل ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد رویہ ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے۔ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کر دے گا۔ میں نے کہا، حضرت، اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سُنّی (میرا اشارہ اُس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے) فرمانے لگے، اِسے ایسا بنا لو تو جانوں۔

۱۸۸۱ء میں سرسید ایک وفد اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے حضور میں حیدر آباد دکن لے کر گئے تھے۔ ایک بڑے جلسے میں جو نواب وقار الامرا بہادر مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا، مولانا شبلی نے بھی ایک فارسی نظم اس موقع کے مناسب اپنے خاص لحان میں پڑھ کر سنائی تھی جو لوگوں نے بہت پسند کی۔ جلسہ برخاست ہوا تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ سید صاحب نے فرمایا، ہاتھوں کو کیا چومتے ہو، ان کا مُنہ چومو۔ (یہ اشارہ اُن کی خوش الحانی کی طرف تھا)

ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی مگر عربی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے میری سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا "میری عادت کسی کی سفارش کی

نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوا دیں، خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب میں علی گڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا، خان بہادر مولوی سید فریدالدین احمد صاحب سب آرڈی نیٹ جج کا رقعۂ دعوت سرسید کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمے پر انھوں نے اپنا نام اس طرح لکھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید)۔ سرسید نے اس کے جواب میں جو رقعہ لکھا تو اس کے عنوان میں وہی لفظ لکھ دیے۔ اور "جانی فرید" سے رقعہ شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں، سرسید جب لندن میں تھے ایک بار ڈیوک آف آرگائل نے ڈنر کی دعوت دی۔ جب شراب سامنے آئی تو انھوں نے کہا "میں نوح کی شراب نہیں پیتا، صرف آدم کی شراب پیتا ہوں۔"

مولانا حالی لکھتے ہیں "ان کا (سرسید کا) ایک آرٹیکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہلِ سنّت سمجھتے ہیں حجّت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے آئے۔ پہلے اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سرسید سے اُس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے، کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجّت نہیں تو خلیفۂ اوّل کی خلافت کیوں کر ثابت ہوگی؟ سرسید نے کہا حضرت! نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا۔ وہ یہ سُن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کہ

کچھ لوگ خلیفۂ اوّل کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے ؟ سرسیّد نے کہا، حضرت مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا۔ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو لبوے کامیاب ہوتا۔" یہ سن کر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔ سیّد نے ظرافت کے پیرائے میں مسئلہ خلافت کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار بڑے پُر لطف طریقے سے کیا ہے۔

سرسیّد پر اخباروں میں بڑی لے دے ہوتی اور آوازے کسے جاتے۔ جب کسی اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تو تعجّب کرتے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں " ہمارا حال اُس بُڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے۔"

سرسیّد لکھتے ہیں کہ " ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارن پور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی......... ایک صاحب نے کہا کہ " ہے تو کرسٹان، مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہو گی تو اسی کرسٹان سے ہو گی۔" یہ نقل سن کر میں بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو تو اِس کرسٹانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ....
صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے۔ اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا " آں قرمساق ہمہ خوش می گوید"۔ صائب کہتا ہے: جیسی عزّت مجھ کو قرمساق کے لفظ سے حاصل ہوئی، اعلا سے اعلا خطاب سے بھی ممکن نہیں۔" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرسٹان میرے

لیے عزت قومی کا باعث ہو۔"

سرسید جب حیدرآباد تشریف لے گئے تو ریلوے اسٹیشن پر بہت سے اصحاب استقبال کے لیے آئے۔ مولوی اکبر نے جو حیدرآباد کے نہایت ممتاز اور بااثر اشخاص میں تھے، آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا لوگ آپ کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ آپ کے پاس کیا نشانی ہے۔ سرسید نے داڑھی اُٹھا کر اپنی رسولی دکھا دی۔

پروفیسر بارنی کوف نے جو لینن گراڈ کی یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر ہیں، اُردو نثر کا ایک انتخاب چھاپا ہے جس میں اُردو کے مشہور ادیبوں کے مضامین یا اقتباسات ہیں۔ اُن کو سرسید کے کلام میں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی اور ملا تو یہ لطیفہ جو اُنھوں نے مولانا حالی کی زندۂ جاوید کتاب حیات جاوید سے نقل کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُن کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ایک اُن میں سے پادری تھا۔ اُس کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ سرسید سے کہا "مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔" سرسید نے کہا "میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟" اُس نے کہا "خدا کی۔" سرسید نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے میں اُن کو نہیں جانتا۔" پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے؟" اُنھوں نے کہا "مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا "آپ اس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں، میں اُس سے کبھی نہیں ملا۔" سرسید نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر

بُلایا ہو، نہ مجھ کو اُس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں۔" پادری یہ سُن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے۔"

یہ تو خیال نہیں ہو سکتا کہ پروفیسر صاحب اسے سچ مچ سرسید کا اعتقاد سمجھے ہوں۔ لیکن انھیں اپنے سوویٹ طالب علموں کے لیے اس سے بہتر تحفہ اُردُو ادب میں نہیں مِل سکتا تھا۔

ایک اور لطیفہ جو میں پہلے بھی سُن چکا تھا اور جسے مولانا حالی نے بھی نقل کیا ہے سُننے کے قابل ہے۔ ایک بار وہ سخت بیمار پڑے تھے۔ ڈاکٹر نے تقویت کے لیے ایک دوا تجویز کی۔ پوچھا اس میں شراب تو نہیں۔ کہا ہے تو سہی۔ یہ سُن کر پینے سے انکار کر دیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

سیّد صاحب کے ایک منشی تھے۔ اُن کا نام نجم الدین تھا۔ ذرا چھوٹے قد کے تھے۔ سیّد صاحب اُنھیں ٹُوڈ کہتے تھے اور اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ اب تک زندہ ہیں۔ اُن سے وہ خط لکھواتے یا کبھی مسودہ صاف کرواتے اُن کا خط بہت صاف اور اچھا ہے۔ اُن کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے اور لطیفے ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے۔ اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یک جا مرتب ہو جاتے تو اُن میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے اُن کی ظرافت کے پُرلطف لطیفے بھی ملتے۔ ان کے خطوط کا جو مجموعہ شایع ہوا ہے وہ اصل خطوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارگراں کے ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال

شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔

یوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری ہمت اور توجہ صرف ہوئی وہ تعلیم تھا۔ باقی سب تحریکیں خواہ مذہبی یا سیاسی، معاشرتی یا اَدبی سب اسی کے ذیل میں آجاتی ہیں۔

اُنیسویں صدی میں ابتری اور طوائف الملوکی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی لڑائی جھگڑے، بدعنوانیاں، دست درازیاں عام ہوگئی تھیں۔ رعایا بدحال اور پریشان تھی ان حالات میں انتظام، انصاف اور امن و امان مفقود تھا۔ انگریز اپنی دانش مندی وتنظیم اور عیاری کے بل پر اور اہل ملک کی بے اُصولی، غفلت اور غداری کی بدولت ملک پر چھائے جا رہے تھے جہاں جہاں اُن کا قبضہ ہوجاتا تھا وہاں انتظام اور امن و امان کی صورت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ جب رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور استقلال حاصل ہوگیا تو اُنھوں نے عدالتیں، انتظامی دفاتر، ڈاک خانے، تار، ریلیں، مدرسے اور یونی ورسٹیاں قائم کیں۔ جن لوگوں نے پہلے کی بدنظمی، غارت گری اور بدامنی دیکھی تھی وہ انگریزوں کی دانشمندی اور انتظامی قابلیت کے قایل ہوگئے اور ان کی حکومت کو بہت غنیمت سمجھنے لگے۔ ہمارے زمانے میں جو بڑے بوڑھے رہ گئے تھے وہ اسی خیال کے تھے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل بہت بعد میں رونما ہوئے۔ جان و مال کی حفاظت اور امن سب سے مقدم ہے۔

سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی حالت بھی دیکھی تھی اور بعد کی بھی۔ اُنھوں نے دلّی کی سوسائٹی اور قلعہ کی صحبتیں اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں۔ دیکھی کیا تھیں اُن میں پرورش پائی تھی۔ زوال بہت پہلے سے شروع ہوگیا تھا

مگر زوال کا احساس نہ تھا۔ غفلت، بے حسی، آرام طلبی، کم ہمتی، خود غرضی عام تھی۔ اور مستقبل سے بے خبر البتہ ماضی کا فخر ضرور باقی تھا۔ دنیا میں جو نیا انقلاب اور نئے حالات پیدا ہو گئے تھے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، یہ نہیں کہ ان میں باہمت، اُلوالعزم، بہادر، صاحب فکر اور ہمدرد لوگ بالکل نہ تھے۔ کہیں کہیں ضرور تھے مگر عام اخلاق گر گئے تھے۔ قومی شیرازہ بکھر گیا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک رشتہ میں منسلک کرے اور غفلت سے بیدار کر کے آگے بڑھنے کا صحیح رستہ دکھائے۔ انگریزی حکومت میں سب سے زیادہ خسارے میں مسلمان رہے۔ ۵۷ء کے بعد تو اُن پر تباہی و بربادی اور مصائب و آلام کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ انگریز ان کو ۵۷ء کی شورش کا بانی، اپنا دشمن اور اپنی حکومت کا غدار سمجھتا تھا۔ اور ان کو مٹا دینے پر تُلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا تصور صرف یہ تھا کہ اُس نے حکومت اِن سے لی تھی۔ وہ فاتح تھا اور یہ مفتوح۔ مفتوح ہندو بھی تھے مگر ان کو وہ اپنا مخالف نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ اِدھر ہندو مسلمان کا مفتوح رہ چکا تھا، خوش تھا کہ اُسے مسلمان سے بدلہ لینے کا اب موقع ملا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بڑی نازک اور قابل رحم تھی۔ وہ چکّی کے دو پاٹوں میں پسا جاتا تھا۔ بہت سی جاگیریں اور زمینداریاں بغاوت کے الزام میں سرکار میں ضبط ہو چکی تھیں جو باقی تھیں وہ غفلت اور عیش پسندی کی بدولت ہاتھ سے نکلتی چلی جا رہی تھیں۔ سرکاری ملازمت سے وہ ویسے ہی محروم تھا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کو زوال آ چکا تھا لیکن ۵۷ء سے پہلے اور اُس کے بعد بھی قصبات وغیرہ میں مسلمانوں کا اثر باقی تھا اور باوجود اقلیت کے وہ اکثریت پر بھاری تھے۔ لیکن یہ چند روز کی بہار تھی۔ آفتاب اقبال گو غروب ہو گیا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا۔

سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے طوفان میں خود بھی بڑی کھکھیڑ اُٹھائی تھی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور ذلّت کے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے جو بھلائے نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں پر مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی خود اِن پہ بھی کچھ دن مایوسی کا عالم رہا۔ اور اِس درد سے بے تاب رہے۔ یہاں ہم اُنھیں کی تحریر پیش کرتے ہیں جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا دردِ دل اور قوم کی سوگواری ٹپک رہی ہے۔

"بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیے سے زیادہ ملکیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دِل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دُنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندُستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی، اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مرادآباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہوگئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہٗ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

اس کے بعد ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ قوم کو اس ورطۂ ذلت سے کیونکر نکالا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم ہے اور تعلیم بھی جدید۔ یہ ساری آفت ، مصیبت، پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ دُنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی جدید راہوں سے ناواقف ہیں۔ جہالت تمام برائیوں اور عیوب کی جڑ ہے۔ لیکن مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی۔ انگریز سے بھی زیادہ۔ انگریز جب ہمارے ملک میں آئے تو ہمارے بزرگ اُن کی تہذیب و اخلاق اور ان کے اطوار و کردار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کے طریقے ہم سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا، بات چیت، لباس غرض کوئی بات ہم سے نہیں ملتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کو اُن کی ہر چیز سے نفرت تھی اور اُس کو نجس سمجھتے تھے۔ دہلی کالج میں جب ایک اعلا انگریز حاکم آیا اور اُس نے مولوی صاحب سے مصافحہ کیا تو مولوی صاحب نے وہ ہاتھ الگ تھلگ رکھا اور اُس کے جاتے ہی رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ ہمارے اُس وقت کے ایک لغت نویس نے فرنگی کی یہ تعریف کی ہے۔ "یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"۔ اس جملہ کا آخری جز بہت لطیف اور پُر معنی ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ انگریز کاریگر اچھا ہے۔ بندوق، توپ اچھی بنا لیتا ہے۔ رہا علم سو اس سے بے بہرہ ہے۔ نئے مدرسوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اُسے وہ علم نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان مدرسوں اور کالجوں کو چھلے کہتے تھے۔ اسی لیے انھیں انگریزی تعلیم سے نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کو مذہب سے منحرف کرنے اور عیسائی بنانے کی ترکیب ہے۔

اس تعصب کا توڑنا آسان کام نہ تھا۔ اس میں اہلِ علم اور عوام ایک تھے یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ جب سرسید نے اس منزل میں قدم اُٹھایا تو ہر طرف سے مخالفت

کا طوفان برپا ہو گیا اور انھیں کرسٹان، ملحد، کافر کے خطاب عطا ہوئے۔ لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا اور یہ کسی قدر صحیح بھی تھا کہ مغربی تعلیم خصوصاً سائنس کے مطالعہ سے نوجوانوں کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں، ان کا ایمان کم زور ہو جاتا ہے اور دہریت اور الحاد کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے۔ اس خطرے کی روک تھام کے لیے سید کو مذہب کی قلمرو میں دخل دینا پڑا۔ اور جس طرح خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب یونانی فلسفہ اور علوم طبیعی کے رواج نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کیے تو علمائے اسلام نے اُن کے توڑ میں مذہب کی حفاظت اور حمایت کی کوشش کی اور انھیں کوششوں کا نتیجہ علم کلام ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں جدید فلسفہ اور سائنس کے رواج سے جو مذہب کی طرف بدظنی اور روگردانی پیدا ہو چلی تھی، اس کے مقابلے کے لیے سرسید نے نیا علم کلام ایجاد کیا۔ اور اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جدید فلسفہ اور سائنس سے اسلام کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور ان مسائل اور خیالات اور توہمات کی تردید کی جو جزو اسلام سمجھے جاتے ہیں مگر درحقیقت اسلام سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ سرسید نے جب مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تھا تو لازم تھا کہ اُس سے جو خرابیاں پیدا ہوں ان کے رفع کرنے کی تدبیر کی جائے۔ یہ بڑی وجہ تھی کہ انھیں مذہبی مسائل میں دخل دینا پڑا۔ اور جو تفسیر قرآن اور بے شمار مضامین لکھنے کی محرک ہوئی۔

یہ کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اُسے جس طرح اپنے ہم قوموں سے لڑنا جھگڑنا پڑا۔ اسی طرح انگریزوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بہت سخت بدظنی اور عداوت جاگزیں تھی۔ اس میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو اسلام کو مانع ترقی خیال کرتے تھے اور اسلام پر طرح طرح کے بہتان اور اعتراض کرتے تھے۔ خطبات احمدیہ، ابطال غلامی

اور بے شمار مضامین انھیں خیالات کی تردید میں لکھے۔ دوسرے وہ جو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا بدخواہ اور غیر وفادار اور اپنی حکومت کے حق میں باعث خطر سمجھتے تھے۔ پہلے گروہ میں مشنری اور مذہبی خیال کے لوگ تھے، اور دوسرے گروہ میں ارکان حکومت۔ پہلا مسئلہ عام تھا اور وہ صرف ہندستان کے انگریزوں تک ہی محدود نہ تھا۔ البتہ دوسرا مسئلہ خاص طور پر اُن انگریزوں سے متعلق تھا جن کے ہاتھ میں حکومت کا نظم و نسق اور اقتدار تھا۔ اور اس کے لیے فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ اس میں سرسید کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا زبردست اور مدلّل جواب جس نے ڈاکٹر صاحب کے دلائل کے پرخچے اُڑا دیے، منجملہ اسی نوع کی کوششوں میں سے ہے۔ بائبل کی تفسیر بھی اسی غرض سے لکھنی شروع کی تھی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کے دل سے بدظنی دور ہو جائے بلکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیا جائے اُن کے واجب حقوق ان کو دیے جائیں اور گورنمنٹ ان کے تعلیمی اور تہذیبی امور میں جائز امداد دے اور انگریزوں اور مسلمانوں میں باہم دوستانہ تعلّقات ہوں۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی اُنھوں نے محسوس کی۔ کیونکہ بغیر انگریزی تعلیم کے انگریزوں کے کیریکٹر، ان کی تاریخ، ان کے نظم و نسق اور اصول حکومت کا سمجھنا مشکل تھا۔

لوگوں میں یہ ایک عام خیال ہو گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خوشامدی ہیں۔ بعض مخالفوں نے تو انھیں ابن الوقت تک کہہ دیا۔ جس شخص نے ان کی زندگی اور سیرت کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ کبھی ایسا خیال نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ عالی مرتبہ انگریزوں کو اپنے کالج میں بلاتے، جلسوں میں مدعو کرتے، لفٹنٹ گورنر، وائسرائے اور بڑے بڑے انگریز آتے، کالج کا معائنہ

کرتے، ان کو ایڈریس دیے جاتے، وہ جواب دیتے۔ اسی طرح ہندستانی رؤسا، عالی مقام حکام اور والیان ریاست کو بھی مدعو کیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض وقت وہ اپنی تقریریں ایسی باتیں کہہ جاتے جس میں خوشامد کا شائبہ پایا جاتا تھا لیکن وہ ان کا سچا دلی خیال ہوتا تھا، بناوٹ یا ریا نہ تھی۔ بالفرض اسے خوشامد پر محمول کیا جائے تو اس میں کوئی ذاتی غرض نہ تھی یہ سب کچھ قوم کے مفاد کی خاطر تھا جس شخص نے ایسے نازک زمانے میں جب کہ آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، مسلمان ہونا بذاتِ خود ایک جرم ہو، طرح طرح کے الزام تھوپ کر اُسے غیظ و غضب کا شکار بنایا جا رہا ہو، "اسباب بغاوت" جیسی کتاب لکھی ہو جس پر تمام انگریز حکام بے حد برہم ہوئے اور انھیں باغی اور قابلِ دار سمجھا گیا اور پارلیمنٹ میں اس پر بحثیں ہوئیں۔ جو شخص آگرے کے دربار (۱۸۶۷ء) سے اس بات پر خفا ہو کر چلا آیا ہو کہ وہاں انگریزوں اور ہندستانیوں کی نشست میں امتیاز کیا گیا اور ہندستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں نیچے جگہ دی گئی جس پر بالا دست حکام بہت بگڑے اور گورنمنٹ نے جواب طلب کیا۔ حالاں کہ اس دربار میں اُن کو طلائی تمغہ ملنے والا تھا جس نے باوجود شمالی مغربی حکومت کے معمولی ملازم ہونے کے لندن سے واپسی پر حاکم وقت لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور سے ملاقات کرنا محض اس وجہ سے ناپسند کیا کہ اس نے سرسید کے تعلیمی پمفلٹ کے بعض اعتراضوں کی تردید اپنی ایک تقریر میں کی۔ سر ولیم نے اپنے ایک خط میں اُن سے دوستانہ شکایت کی۔ جس نے ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا دنداں شکن جواب دیا ہو جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان مذہباً انگریزی حکومت کا غیر وفادار اور باغی ہے اور انگریزی حکومت کے خلاف لڑنا اور جہاد کرنا اس کا مذہبی فرض اور یہ کہ ہندستان کے مسلمان اب بھی گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر

چلے آتے ہیں۔ سرسید کے اس جواب کا انگلستان کے اخباروں میں بہت چرچا ہوا۔ اور تعریفی تبصرے چھپے اور ڈاکٹر منٹر پر بڑی لے دے ہوئی۔ جو سر ولیم میور کی کتاب " لائف آف محمد" پڑھ کر بے تاب ہو گیا ہو جس میں اسلام کی حقانیت اور پیغمبر اسلام صلعم کے کیریکٹر پر حملے اور اعتراض تھے۔ ہندستان میں جواب کے لیے کتابوں اور نوشتوں کا کافی سامان نہ ملنے کی وجہ انگلستان کا سفر اختیار کرتا ہو اور اس کی اشاعت کے ناقابل برداشت مصارف سے زیربار ہو کر اپنا سامان اور کتب خانہ بیچتا اور کوٹھی رہن کرتا ہو اور دن رات مسلسل محنت کرکے اپنی یادگار ایک بے مثل اور محققانہ تصنیف خطبات احمدیہ چھوڑ جاتا ہو۔ جس نے تعلیمی معاملے میں صاف یہ کہہ دیا ہو کہ " ہمیں گورمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہو تو گورمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہو مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔" جس شخص نے زمانۂ ملازمت میں کبھی اپنے بالادست انگریز حکام کی ناجائز سفارشوں یا احکام کی تعمیل نہ کی ہو اور اپنی آزادی کو قائم رکھا ہو۔ جس شخص نے اُن تمام یورپین افسروں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہو، جنھوں نے مدرستہ العلوم کی مخالفت کی تھی، یا اس کے لیے سرکاری امداد ملنے میں مزاحم ہوئے تھے۔ جس نے ہر موقع پر جب ہندستانیوں کی ہتک یا ذلت کی گئی ہو، انگریزوں پر سخت نکتہ چینی اور اُن کی مخالفت کی ہو، اس کو انگریزوں کا خوشامدی کہنا سراسر بہتان ہو۔

جب کبھی ان کو ہندستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا حال معلوم ہوتا تو سخت رنج ہوتا اور بہت بگڑتے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس قسم کے واقعات کے متعلق بے شمار آرٹیکل شائع ہوئے ہیں۔ میری موجودگی میں اُنھوں نے اپنا

ایک واقعہ بیان کیا کہ علی گڑھ میں ایک سشن جج آئے جن کی نسبت یہ شکایت تھی کہ ہندستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ سرسیّد اُن سے نہیں ملے۔ کچھ دنوں بعد لفٹنٹ گورنر علی گڑھ تشریف لائے۔ سرسیّد سے ملاقات کے دوران میں باتوں باتوں میں یہ کہا کہ اب تک آپ سشن جج صاحب سے نہیں ملے۔ سرسیّد نے کہا کہ اوّل تو اُن کو اپنے آداب کے مطابق مجھ سے ملنے آنا چاہیئے تھا۔ خیر یہ بھی نہ سہی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہندستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے اس لیے میں نے اُن سے ملنا پسند نہیں کیا۔ چند روز کے بعد سشن جج صاحب خود ملنے آئے۔ ایسے ہی علی گڑھ میں مسٹر واٹسن کلکٹر ہو کر آئے جو کسی ہندستانی کو جوتا اُتارے بغیر اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتے تھے۔ سرسیّد اُن سے نہیں ملے۔

قومی لباس کا اُنھیں بہت خیال تھا۔ ہندستان میں مختلف مقامات میں مختلف لباس تھے۔ اُن میں سے کسی میں کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب کا ایک ہونا۔ چناں چہ اس بنا پر جیسا کہ اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے سرسیّد نے ترکی لباس اختیار کیا جو کہ اُس وقت ملّتِ اسلامیہ کی معزز ترین جماعت اور اسلام کے سب سے عظیم الشان فرماں روا کا لباس تھا۔ بعض تنگ دل اور متعصب انگریز اس لباس کو دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اسی طرح جب کوئی ہندستانی انگریزی لباس میں ہوتا تو ناراضی کا اظہار کرتے۔ سرسیّد اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ چناں چہ جب لارڈ ڈفرن نے ایک موقع پر اپنی تقریر میں اس قسم کے تبدیل لباس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا خیال ظاہر کیا تو سرسیّد نے اس کے جواب میں نہایت سخت آرٹیکل لکھا۔ اس معاملے میں ایک واقعہ خاص میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میں بیان نہ کرتا' لیکن چوں کہ

اس سے سرسیّد کے خیال کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہو اس لیے مجھے بیان کرنا پڑا۔

سیّد صاحب کو بہت دنوں سے یہ دُھن تھی کہ کالج میں قومی لباس (جو اُنھوں نے اپنے لیے بھی تجویز کیا تھا) رائج کیا جائے۔ چناں چہ اس خیال سے فرمایش کر کے کانپور کے کسی کارخانے سے ایک نیلگوں سیاہ (بلو بلیک) سرج کا ایک تھان تیار کرایا۔ جب یہ کپڑا آیا تو اس میں سے ایک ترکش کوٹ اپنے لیے ایک میرے لیے اور ایک سیّد راس مسعود کے لیے، جو اس وقت بچے تھے سلوایا سیّد محمود نے شکایت کی ہمارے لیے نہیں۔ کہا اس تھان میں اتنی گنجایش نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ دلّی سے سیاہ کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرستہ العلوم" کڑھوا لائے تھے۔ کالر پر "مدرستہ" ایک طرف اور "العلوم" دوسری طرف ٹکا ہوا تھا۔ جب کالر کا ٹک لگاتے تو سامنے پورا دارالعلوم آجاتا۔ جس وقت درزی میرا کوٹ سی کر لایا تو میں اس وقت سید محمود کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے بلایا۔ درزی نے مجھے کوٹ پہنایا۔ وہ پہنا ہی چکا تھا کہ جھٹ سیّد صاحب کرسی سے اُٹھے اور مجھے سلام کیا اور کہا "تم میری ہو"۔ بجائے اس کے کہ میں سلام کرتا اُنھوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی۔ اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

چند روز کے بعد فرمایا کہ طالب علموں سے نام بنام دریافت کرو کہ وہ اس لباس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے بھی ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی۔ سب نے اسے پسند کیا۔ صرف دو چار ایسے تھے جنھوں نے کہا ہمیں اس سے اختلاف تو نہیں البتہ کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ ایک روز حسبِ معمول سیّد صاحب شام کو کالج تشریف لائے۔ اتفاق سے میں بھی

اُدھر ہی جا رہا تھا۔ گاڑی میرے پاس سے گزری تو ٹھیرا لی اور پوچھا کیا ہوا۔ میں نے کہا سب طالب علم اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ صرف دو چار ایسے ہیں جنھیں اختلاف تو نہیں لیکن یہ کہتے ہیں اگر کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے اُن کو نکال دو۔ اُن کی یہ خفگی بچوں کی سی تھی۔ دو چار منٹ رہی اور پھر کچھ نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد لفٹنٹ گورنر کالج میں تشریف لائے۔ اسٹریچی ہال میں بڑا جلسہ ہوا۔ لفٹنٹ گورنر کے ہاتھ سے انعامات تقسیم کرائے گئے جو لڑکے یہ لباس پہنے ہوئے تھے اُنھیں سید صاحب نے اگلی صف میں خاص جگہ بٹھایا۔ جب انعام وغیرہ تقسیم ہو چکے اور گورنر رخصت ہونے لگے تو وہ اُن کو ہمارے پاس لائے اور خوشی خوشی یہ لباس دکھایا۔ گورنر نے بھی بہ ظاہر خوشنودی کا اظہار کیا۔ وہ جب کسی طالب علم کو اس لباس میں دیکھتے تو باغ باغ ہو جاتے۔ یہ کارروائی اُس زمانے میں عمل میں آئی جب ہمارے ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر بیک رخصت پر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو زبان سے تو کچھ نہ کہا اور کہتے کیا، لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوا کہ دل ہی دل میں بہت گھٹے آدمی ہوشیار تھے خاموش رہے۔ یہ ۱۸۹۳ء کا واقعہ ہے۔

اسی سال کالج کی جماعتوں میں فوجی ڈرل جاری کی گئی۔ اس سے صرف سال چہارم (یعنی بی۔اے کی آخری جماعت) مستثنیٰ تھی۔ ایک دن پرنسپل مسٹر بیک جن کی تحریک سے ڈرل کا نیا نیا انتظام جاری ہوا تھا، ہماری جماعت میں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں رنگین ریشمی ململوں کے کئی نمونے تھے۔ فرمانے لگے کہ تم اپنی جماعت کے لیے ان میں سے کون سا رنگ پسند کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ڈرل کے لیے اس قماش کے کپڑے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ فرمایا

سوال رنگ کا ہی کپڑے کا نہیں۔ غرض ہر جماعت کے لیے الگ الگ رنگ کی ریشمی ململوں کی شیروانیاں اور پگڑیاں تجویز ہوئیں اور اسی وردی میں طالب علم ڈرل کرتے تھے۔ دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں ڈرال پریڈ کے لیے ایسا نازک اور ملائم لباس ہو۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیوں کی ڈرل کے لیے بھی کوئی ایسا لباس تجویز نہ کرتا۔ ان نوجوان طالب علموں کو جو قومی بہبودی اور ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کو تیار کیے جا رہے تھے اور جن سے قوم کی خاطر زندگی کے میدان کا رزار میں محنت و مشقت ایثار و جاں نثاری کی توقع تھی اس قسم کے لباس میں ڈرل پریڈ کرانا جو کسی رئیس کے لیے زیادہ موزوں تھا کس قدر نامناسب اور مضحکہ خیز تھا۔

میں جب طالب علموں کو اس لباس میں ڈرل کرتے دیکھتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میرے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ معاملہ کسی طرح سید صاحب تک پہنچانا چاہیئے۔ اس کے متعلق میں نے مولوی حمیدالدین مرحوم سے بھی جو میرے ہم جماعت تھے مشورہ کیا۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اس میں درپردہ مسٹر بیک کی شکایت نکلتی تھی۔ مسٹر بیک بڑے جابر اور خود رائے تھے۔ اس زمانے میں ان کا اثر اور اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں تو خیر ایک طالب علم تھا کسی بڑے سے بڑے ٹرسٹی حتیٰ کہ نواب محسن الملک تک کی یہ مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف سید صاحب سے کچھ کہہ سکیں۔ آخر ایک روز دل کڑا کر کے اس مہم کے سر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مولوی حمیدالدین کو بھی ساتھ لیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی ہم کالج سے سیدھے سید صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ سید صاحب حسب معمول کام کر رہے تھے ہم سلام کر کے سامنے بیٹھ گئے۔ سید صاحب برابر لکھتے رہے اور ہم خاموش بت بنے بیٹھے رہے۔ میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اس سوچ میں

تھا کہ اس ناگوار ذکر کو کس طرح چھیڑوں۔ اتنے میں ملازم نے کھانا چننا شروع کیا۔ کھانے کی میز اسی حال میں تھی۔ جب کھانا آ گیا تو سیّد صاحب اٹھ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ دوسری طرف سے سیّد محمود بھی آ پہنچے، علیک سلیک کے بعد اُنھوں نے کھانے کی صلاح کی۔ میں نے کہا ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ کہنے لگے خیر یہاں آ کر بیٹھ تو جاؤ۔ میں سید محمود کے پاس جا بیٹھا۔ زبان یاری نہیں دیتی تھی کہ کہوں تو کیا کہوں اور کیوں کر کہوں۔ حسن اتفاق کہ خود سید صاحب ہی نے جنھیں اُن دنوں قومی لباس کی دھن سمائی ہوئی تھی، اپنے تجویز کیے ہوئے لباس کا ذکر چھیڑا، میں نے کہا، اب تو دوسرا ہی لباس شروع ہو گیا ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے عرض کیا جب سے ڈرل شروع ہوئی ہے تو اس کے لیے نیا لباس تجویز کیا گیا ہے۔ کہنے لگے وہ صرف ڈرل کے لیے ہے، اس سے ہمارے لباس کو کیا تعلق میں نے کہا ڈرل کے لیے رنگین ریشمی اچکنیں اور ریشمی ململوں کی پگڑیاں تجویز کی گئی ہیں۔ کہنے لگے، ہاں میں نے بھی دیکھا زین العابدین کا لونڈا برساتی ٹڈا بنا پھرتا ہے۔ سید محمود نے فرمایا کہ ڈرل پریڈ انگریزوں کی چیز ہے اس لیے ہم نے یہ کام انگریز پروفیسروں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرض کرو میں ایک کلب بناتا ہوں اور اس کی ممبری کے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ ہر ممبر دُم لگا کر آئے۔ اب ہر ممبر کو اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ جسے یہ شرط پسند نہ ہو وہ ممبر نہ بنے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ سب کے لیے یہ شرط لازم کر دیں تو پھر۔ کہنے لگے کہ سوا تعلیم کے کوئی دوسری چیز لازم نہیں ہو سکتی اور کسی کو جبر کرنے کا حق نہیں۔ سیّد صاحب نے فرمایا کہ محض اس وجہ سے ایک شخص ورزش یا کسی اور تحریک سے محروم کر دیا جائے، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ ڈرل تعلیم کے درمیانی گھنٹوں میں ہوتی ہے۔ کسی جماعت کی دوسرے

گھنٹے کے بعد کسی کی تیسرے گھنٹے کے بعد تو اب لڑکے پوٹلیاں باندھ باندھ کر لانے سے تو رہے کہ تعلیم کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی ایک لباس بدلیں اور دوسرا پہنیں۔ اس کے لیے اتنی مہلت اور نہ اس کا موقع۔ لامحالہ ڈرل ہی کا نفیس رنگین لباس پہن کر کالج کی جماعتوں میں آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ڈرل میں جا شریک ہوتے ہیں یہ سنتے ہی سید صاحب جلال میں آگئے کانٹا ایک طرف اور چھری دوسری طرف جا پڑی۔ فرمانے لگے اس میں ایک پیچ ہے وہ میری عمر بھر کی محنت خاک میں ملاتا چاہتا ہے۔ میں ملکہ معظمہ کی لیوی میں بھی اسی لباس میں گیا اور کوئی تبدیلی منظور نہ کی۔ سید محمود نے کہا ہر شخص تو آپ سا نہیں ہوسکتا۔ پھر سید محمود کی طرف مخاطب ہو کر کہا آج کالج میں میرا لکچر ہے تم بھی آنا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ اب تم جاؤ۔ ہم اٹھ کر چلے آئے۔ رستے بھر بہت پریشان رہا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہنے کو تو میں سب کچھ کہہ گیا، لیکن سید صاحب نے مسٹر بیک سے اس کا ذکر کر دیا تو میری خیر نہیں۔

سید صاحب نے کالج کے لیے آنریری لکچروں کی تجویز کی تھی اور پہلا لکچر اُنھوں نے خود دینا منظور کیا تھا۔ اوپر کی گفتگو میں اسی لکچر کی طرف اشارہ تھا۔ غرض نماز جمعہ کے بعد سید صاحب تشریف لائے۔ اسٹریچی ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے مقابل ہال کے آخر میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ سید صاحب ہال میں اس طرح داخل ہوئے جیسے کوئی جہاز آتا ہے۔ تخت پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ ایک کرسی اور لاؤ۔ چناں چہ ایک اور کرسی تخت پر لا کر رکھ دی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ مسٹر بیک کہاں ہیں۔ کسی نے کہا یہ ہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ

گیا کہ یہاں آکر بیٹھو۔ یہ سُن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور سمجھا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ جب مسٹر بیک بیٹھ گئے تو اُنھوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی:۔

"اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمھارے اُستادوں، تمھارے ماں باپ، تمھاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لیے جمع ہو، مختلف علوم پڑھتے ہو اور مختلف مصنّفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ مقولات اخلاق سے لُطف اُٹھاتے ہو۔ تمھارے اُستاد...... گو وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنّفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں، مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنّف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اُس کو بنایا ہے۔ اُس کے حروف بہت پُرکار اور مجسّم ہیں مگر اُن کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اُس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر اُن کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اُس کے پڑھنے کے لیے اُس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمھاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمھارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا چاہیے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنی کیوں کر سمجھو۔

"اے عزیزو اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یانی زندگی" یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا

اور اس کالج کا ہی۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھ اور داغ دار نہ کیا تو تمھاری آیندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے۔ ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہی"

اس کے بعد آنھوں نے زندگی کے مختلف زمانوں پر تبصرہ کیا کہ بچپن میں تمھاری کیا حالت تھی اور ماؤں نے کس طرح شفقت اور محبت سے پرورش کی۔ یہ زمانہ بھی گزر گیا اور دوسرا زمانہ آیا جس میں تم چلنے اور پھرنے اور کھانے پینے لگے۔ یہ بھی گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جس میں تعلیم ہوئی اور مذہبی باتیں سکھائی گئیں۔

"یہ زمانہ بھی چند سال میں گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی .... کیوں کہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمھارے پیدا ہوگئے تھے اور ہر وقت تمھاری گھات میں لگے رہتے تھے .... تمھارے ماں باپ نے جہاں تک اُن سے ہو سکا تم کو ان دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا۔ کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر دشمنوں کے پنجے میں پھنسا رہا۔ اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ اس سے نکلنا ناممکن ہوا۔ مگر جو بچے یا کسی قدر بچے دشمنوں نے ان کا بھی ساتھ نہ چھوڑا اور گھات میں لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے۔ تم ان کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور کبھی اپنی صورت اس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالاں کہ وہ تمھارے دشمن تھے۔

یہ زمانہ بھی تمھاری زندگی کا گزر گیا مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہوگئے اور اُن سے پناہ میں رہنے کے لیے تم نے ایک نہایت

زبردست اور عاقل ماں کی تلاش کی .... اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے اور سمجھے تمھاری وہ عاقل ماں ہے کون ؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہوئے اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔

تم سمجھے کہ وہ تمھاری نئی زندگی کیا ہے ؟ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گزارا تو تمھارا بیڑا پار ہے ورنہ منجدھار میں ڈوبنا ہے جس کے بعد پھر اُبھرنا اور ترنا نہیں' اب تم کو اختیار ہے چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ' چاہو منجدھار میں ڈبوؤ......

اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ سب سے اوّل اور تمام برکتوں کی جڑ تمھارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندستان کے ہوں یا پنجاب کے' پورب کے ہوں یا پچھم کے' اُتر کے ہوں یا دکھن کے' جب وہ سب تمھاری اس عاقل ماں کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمھارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے اُن کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اُس پہلے اُصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو' توڑ دیا۔ اور جس طرح ایمان کے لیے کلمۂ توحید پہلا رُکن ایمان کا ہے۔ اسی طرح وحدت کا پہلا رکن بورڈنگ ہوس کی فائدہ مندی کے لیے ہے اور جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا۔ اس لیے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائیوں کے آپس میں محبت اور دوستی برتو "

اس ضمن میں بورڈنگ ہوس میں ایک جگہ رہنے سہنے' کھانے پینے' ہلنے جلنے' مل کر کھیلنے' ادبی تحریکوں میں شریک رہنے کے اثرات کا ذکر کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ " تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی و ذہنی ہیں اُن کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اُس برادری اور دلی محبت اور

دوستی کی جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو ظاہری نشانی کیا ہے؟ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے جس کے پورا نہ کرنے سے تم صرف دُنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو۔ وہ نشان کیا ہے؟ جماعت کی نماز ہے جو خدا نے جیسا کہ وہ واحد ہے تمھاری آپس کی وحدت کے لیے مقرر کیا ہے۔" پھر نماز سے جو عملی طور پر یگانگت پیدا ہوتی ہے اُس کی توضیح کی۔

اس کے بعد فرمایا کہ "ایک اور چیز اُس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے؟ تم سب بورڈروں کا اور خصوصًا کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس کا ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی صلاح سے کیا تعلق ہے مگر یہ محض غلطی ہے۔ مذہب کی رو سے، دُنیا کے برتاؤ سے بہت سی ظاہری چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں۔" اس سلسلے میں اُنھوں نے مختلف جماعتوں اور فرقوں کی مثالیں دیں کہ لباس کی یکسانی سے اُن میں کیسی ہمدردی اور یک جہتی اور محبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ "جو لباس اب تمھارا ہے یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے۔ یہی لباس سلطان روم اور اُن کے امرا اور نوکر چاکروں کا ہے۔ اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے۔"

اس کی تصریح کرنے کے بعد فرمایا "ہندستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم ہیں انگریز جو ہندستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسی ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے جانے پر اعتراض کرتے ہیں۔"

اس آخری فقرے پر اس زور سے چیرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اُٹھا۔

مسٹر بیک کا رنگ فق ہوگیا اور مُنہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سینکڑوں جلسے ہوئے ہیں اور بعض بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے ہوئے لیکن کسی جلسے میں اس جوش و خروش اور زور سے تالیاں نہیں بجائی گئیں جیسے اس موقع پر۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ "جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندستانیوں اور انگریزوں میں دوستی و محبّت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو۔ باوجود اُن کوششوں کے جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کی کی ہیں ایسے انگریز سے، جو ان باتوں میں کاوش کرتا ہو میں خود کبھی اُس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا۔" اس کے بعد اُنھوں نے سلسلۂ کلام دیر تک جاری رکھا۔ جلسہ برخاست ہونے پر طالب علم اپنے اپنے کمروں میں گئے رنگین ریشمی ململ کی پگڑیاں نکالیں اُنھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی نے قمیصیں بنائیں اور کسی نے کمرے کے پردے۔ اس طرح یہ قضیۂ نامرضیہ ختم ہوگیا۔

جسٹس سیّد محمود کا چیف جسٹس الہ آباد سے کسی معاملے میں جھگڑا ہوگیا تھا۔ چیف جسٹس نے ان کی شکایت گورمنٹ کو لکھ بھیجی۔ سید محمود نے اس کا جواب لکھا جو کئی سو صفحوں پر تھا۔ لیکن ابھی اثنا میں اُنھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ سیّد صاحب اس معاملے کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب اُن کے احباب اور دوسرے لوگوں نے بہت تقاضا کیا تو اُنھوں نے مجبوراً ایک مضمون اپنے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا جس میں سید محمود کی سیرت کی بہت ہی دل چسپ تصویر کھینچی ہے۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ انگریز کے دماغ میں اب تک فاتح ہونے کا غرور سمایا ہوا ہے۔ اور اُسے کسی طرح یہ گوارا نہیں کہ گورا اور کالا ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔ اِس مضمون کا بڑا

چرچا ہوا اور کانگریسی اخباروں نے اُسے خوب اُچھالا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ انگریزی حکومت کو ہندستان اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں موجب برکت سمجھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اس خیال کا اظہار صاف صاف اِن الفاظ میں کیا ہے۔ " میں ہندستان میں انگلش گورمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندُستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورمنٹ کی بدولت نکل سکتے ہیں۔" جسٹس رانا ڈے نے بھی ہندُستان میں انگریزی حکومت کو مصلحت خداوندی اور برکت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سر سید نے یہ بھی صاف صاف کہا ہے کہ انگریزوں سے ہمیں جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ میں ڈنر پر مسٹر بلنٹ کا جام صحت تجویز کرتے وقت اُنھوں نے فرمایا "اگر ہماری کسی آرزو سے وہ (مسٹر بلنٹ) واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے سمپیتھی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلا شبہ میں کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔" اسی تقریر میں یہ بھی کہا " وہ زمانہ جب ہمیں انگریزی حکومت قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بیچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ کاپیل کے عہد نامے کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ مگر اس وقت پر اس پر کچھ کہنا ضرور نہیں کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدے کو کہاں تک پورا کیا۔"

سر سید نے انگریزوں کی بدگمانی جو انھیں مسلمانوں سے تھی اور مسلمانوں کی نفرت جو ان انگریزوں سے تھی، رفع کرنے میں طرح طرح کے جتن کیے۔ مغربی تعلیم اس غرض کی اصل بنیاد تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے امور معاشرت میں

بھی اُسی جرأت سے کام لیا جیسے تعلیم اور مذہب کے معاملے میں۔ مسلمان انگریز اور اس کے کھانے کو نجس سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھانا کھانے کو بمنزلۂ ترک اسلام کے خیال کرتے تھے۔ سرسید نے اس قسم کے توہمات اور تعصبات کا بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ جواز طعام اہل کتاب پر رسالہ لکھا اور خود اس بدعت کے مرتکب ہوئے۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی اور بڑا شور غل مچا۔ وہ حق پر تھے اور دُھن کے پکّے تھے۔ آخر غالب آئے۔ یہ ہندوؤں کی چھوت چھات کا اثر تھا۔ اس کفر کو سیّد احمد خاں نے توڑا اور ایک دن وہ آیا کہ وہی لوگ جو اس فعل پر طعن تشنیع کرتے تھے انگریزوں کو دعوتیں دے دے کر ان کے ساتھ بیٹھ کر شوق سے کھانے لگے۔

سرسیّد کی غرض یہ تھی کہ باہم میل جول اور ربط ضبط بڑھے۔ باہمی نفرت اور بدگمانی رفع ہو اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے حاکم محکومانہ نہیں دوستانہ ہونا چاہیئے اسی خیال سے اُنھوں نے لباس میں بھی تبدیلی کی اور انگریزی طرز معاشرت بھی اختیار کی، جہاں تک میں نے انھیں دیکھا ہے ان میں انگریزی طرز معاشرت معمولی تھی۔ کھانا وہ بے شک میز پر کھاتے تھے اور حسب ضرورت چھُری کانٹا بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن کھانا اُن کا ہندُستانی ہوتا تھا۔ وہی کھانا جو عموماً مسلمان شرفا کے ہاں کھایا جاتا ہے۔ گھر میں وہ کرتہ پاجامہ (غرارہ) پہنے کام کرتے رہتے تھے۔ کالج میں جب کبھی تعمیر کا کام دیکھنے آتے تو ایک عباسی اوڑھ لیتے تھے۔ البتہ جلسوں میں پتلون، ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ کوٹھی بھی اُن کی فرش فرنیچر سے کوئی زیادہ آراستہ نہ تھی۔ مگر اُن کے بعض پیرووں نے اس معاملے میں بڑا غلو کیا۔ اس میں پیش پیش نواب محسن الملک تھے۔ حیدرآباد

میں کوئی ان کا ٹھاٹھ دیکھتا فرنیچر انگلستان سے لائے تو اس کی رکھ رکھاؤ اور صفائی کے لیے ایک انگریز بھی لیتے آئے۔ حیدرآباد سے آنے کے بعد یہ شوق دھیما پڑ گیا تھا۔ لیکن بہت سے سولین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرز معاشرت میں صاحب بہادر تھے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا تھا جسے "نقالوں کا طائفہ" کہنا زیادہ نامناسب نہ ہو گا۔ ان میں نقل ہی نقل تھی۔ ان حضرات کو عام مسلمانوں سے بلکہ متوسط الحال شرفا سے بھی کوئی ربط اور انس نہیں رہا تھا۔

عجیب بات یہ ہو کہ اس عہد کے مسلمانوں میں اصلاح کے جتنے مدعی پیدا ہوئے اُنہوں نے یہی کیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے تو انتہا کر دی۔ مغرب کی تقلید میں رہنا سہنا، کھانا پینا، لباس، ناچ رنگ، شراب خوری اور دوسری خرافات کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہاں تک کہ مدارس سے مذہبی تعلیم خارج کر دی، اور اپنی زبان کا قدیم رسم الخط بھی بدل کر رومن کر دیا۔ ترکی اخبار نویسوں کا جو وفد دلی آیا تھا وہ بار بار بڑے فخر سے اپنے آپ کو یورپین نیشن کہتا تھا۔ دلی کے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں تشریف لائیں لیکن اُنہوں نے یہ درخواست قبول نہ فرمائی۔ خاص کوشش سے اُن کے پروگرام میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا معائنہ بھی رکھا گیا تھا مگر وہاں تشریف نہیں لے گئے اور ہندو یونی ورسٹی بنارس کو (جو اُن کے پروگرام میں نہ تھی) اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ امان اللہ خاں کو اصلاح کی سوجھی تو اس نے بھی اصلاح لباس ہی سے شروع کی۔ لوگوں کو اور خاص کر مولویوں کو جبراً کوٹ، پتلون اور ہیٹ پہننے کا حکم دیا۔ حکم کی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی۔ رضا شاہ پہلوی شاہ ایران ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ اُنہوں

نے لباس کے بارے میں اسی قسم کی سختیاں کیں اور پردے کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ بے پردگی کو جبراً رائج کیا۔ مشہد کے علما نے اس سے اختلاف کیا تو وہاں کے مینار پر مشین گنیں چڑھادی گئیں اور صرف چند گھنٹوں کی مہلت دی کہ اگر اتنے عرصے میں حکم کی تعمیل نہ کی تو شہر کو اُڑا دیا جائے گا۔ مجبور ہو کر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد گورنر نے ایک بڑا جلسہ برپا کیا اور تمام حکام اور شرفا کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سمیت حاضر ہوں۔ ایک صاحب تنہا گئے کیوں کہ اُن کی بیوی نے بھرے جلسے میں بے پردہ جانا گوارا نہ کیا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ جاؤ بیوی کو ساتھ لے کر آؤ وہ گئے اور اُس نیک بخت کو ساتھ لے کر آئے۔ اس کی یہ سزا تجویز کی گئی کہ وہ تمام حاضرینِ جلسہ سے فرداً فرداً ہاتھ ملائے۔ اور تو اور مولانا عبیداللہ سندھی جیسے فاضل عالم دین نے مولویوں کو للکارا کہ کوٹ پتلون پہنو اور داڑھیاں منڈاؤ۔ مولانا نے ایک ملاقات میں مجھ سے فرمایا کہ تم نے انگریزی اُردو لغت لکھ کر بڑا کام کیا لیکن اس کا آدھا فائدہ تم نے غارت کر دیا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا کہ اُردو ترجمہ عربی فارسی خط میں فضول لکھا رومن حروف میں لکھنا چاہیئے تھا تاکہ سارے عالم کو فائدہ پہنچتا۔

ان حالات کو دیکھ کر میں سیّد احمد خاں کو کس مُنہ سے بُرا کہوں۔ اس خدا کے بندے نے تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ ابتدا اس کی طرف سے ہوئی۔ مگر یہ غلو نہ تھا۔ اب یہ باتیں پُرانی ہو گئی ہیں۔ نقالی کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔ لوگ اب ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ سرسید نے تھوڑی بہت تبدیلی اپنی طرزِ معاشرت میں کی وہ کسی ذاتی غرض سے نہ تھی بلکہ اس میں سراسر قومی مفاد مدِنظر تھا۔ مولوی نذیر احمد نے جو کسی کی رو رعایت نہیں کرتے

تھے۔ سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماندو بود کرتے ہیں۔ گودنروں کو مہمان رکھتے ہیں، ان کے ہم نوالہ ہیں جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اُس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سید کو چار دنا چار فیل بانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور وہ بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو اعلا درجے کا انگریز یا اعلا درجے کا نیٹو اُن کی طرف رُخ نہ کرے۔"

سرسید کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا اور یہ خود اُن کا بیان تھا کہ "جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا۔" یہ شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں صاحب علم و فضل اور خاص کر علوم ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ چناں چہ سرسید نے ان کے بعض رسالوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے ماموں یعنی خواجہ فریدالدین کے فرزند نواب زین العابدین خاں بھی فنون ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ سرسید نے ریاضی کی کتابیں اور آلات رصد و اعمال اصطرلاب وغیرہ کے متعدد رسالے ان سے پڑھے۔ اور نانا کے رسائل پرکار دمتنا سبہ وغیرہ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس خاندانی اثر کے علاوہ اس وقت کے باکمال اصحاب مثلاً مرزا غالب، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا صہبائی، نواب ضیاء الدین خاں، نواب مصطفےٰ خاں وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی جس میں علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ سرسید بھی شعر کہتے تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔ سید الاخبار جو اُن کے بھائی نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں جاری کیا تھا جب کہ اُن کی عمر اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔ اس میں زیادہ تر یہی لکھتے تھے۔ نیز بعض مذہبی اور ریاضیات کے رسائل سے قطع نظر جو انھوں نے ابتدا

میں لکھے اُن کی معرکۃ الآرا تصنیف آثار الصنادید ہے جو پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شایع ہوئی۔ اُس وقت اُن کی عمر تیس برس کی تھی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دہلی کی عمارات پر کمال تحقیق اور غیر معمولی محنت اور صحت سے لکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانے میں اور ایسی صحبتوں میں جب کہ ہمارے ادب کا رنگ کچھ اور ہی تھا اور شعر و سخن اور مذہبی تعلیم کے سوا دوسری جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھیں اس قسم کی تحقیقات کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ اس کی تالیف میں جو محنت و مشقت اُنھوں نے اٹھائی وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کارنامہ آئینِ اکبری کی تصحیح و ترتیب ہے۔ آئینِ اکبری اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہے جو اُس زمانے کی ہر قسم کی معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کی زبان اور طرزِ بیان بھی نرالا ہے۔ پھر اُس میں معمولی مختلف انواع و اقسام کے معلومات جن کا سلطنت اور حیاتِ انسانی سے کچھ بھی تعلق ہے ایسے جمع کر دیئے ہیں کہ ان کا صحیح طور پر سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ ایسی کتاب کی تصحیح و ترتیب آسان نہ تھی۔ اس میں اُنھوں نے تحقیق و تلاش کی پوری داد دی ہے۔ یہی نہیں کیا کہ متعدد نسخے جمع کر کے اُن کی تصحیح کی ہو بلکہ اصل کتاب میں جو خامیاں تھیں اُنھیں رفع کیا اور جو کمیاں تھیں اُنھیں پورا کیا، جو فرد گذاشتیں تھیں ان کی تکمیل کی اور جو غلطیاں جو فاضل مصنّف سے ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی۔ کئی سو سکّوں کی تصویریں درج کیں اور ان کے دونوں جانب جو الفاظ تھے وہ نقل کیے۔ اصل کتاب میں کہیں کہیں تصویریں تھیں۔ سرسیّد نے بڑے اہتمام اور محنت سے دِلّی کے چابک دست مصوّروں سے بے شمار تصویریں بنوا کر موقع موقع سے داخل کیں۔ غرض کہ کوئی آئین ایسا نہ چھوڑا جس کی تصویریں نہ دی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی طرف سے بہت مفید اضافے کیے سرسیّد کا یہ کام بھی حیرت انگیز ہے۔ جدید طریقہ تحقیق و ترتیب سے اُس وقت

ہمارے ہاں کوئی آشنا نہ تھا اور نہ اس قسم کے کاموں کا کسی کو شوق تھا اور نہ اُن کی کوئی قدر تھی۔ تاہم سرسید نے جس ژرف نگاہی، محنت و مشقت اور تحقیق و تلاش سے اس کام کو انجام دیا آج کل کا بڑے سے بڑا محقق بھی اس سے زیادہ نہیں کرسکتا........ ان دو کتابوں کی ہمارے ملک میں تو کچھ قدر نہ ہوئی اور قدر ہوئی تو یورپ میں۔ اُس وقت سے جو تالیف و تصنیف کا تانتا بندھا تو آخر دم تک جاری رہا۔ تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح و ترتیب بھی کی جو ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شایع کی اور بعد میں تزک جہانگیری کو مرتب کیا۔

میرا مقصود یہاں اُن کے علمی کارناموں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ تالیف و تصنیف کا شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ علاوہ اُن گوناگوں احسانات کے جو سرسید نے ہماری قوم پر کیے ان کا ایک بہت بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔ ان کی تالیف و تصنیف کا زمانہ ۱۸۴۲ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ اُن کی عمر بائیس تئیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے کی تالیفات چند مذہبی یا ریاضی کے رسائل تھے۔ اُن کی اصل تصنیف آثار الصنادید جو فی الواقع ایک علمی تصنیف ہے۔ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے کے لگ بھگ ۱۸۴۵ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھا۔ یہ کتاب از اوّل تا آخر مقفّٰی اور مسجّع عبارت میں ہے۔ تکلف و تصنع کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس قسم کی عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔ یہ عارضہ لکھنؤ میں بہت پہلے پیدا ہوچکا تھا۔ دِلّی کی سلطنت پر جب زوال آیا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے

تو وہاں کے شعرا اور شرفا نے لکھنؤ کا رُخ کیا جہاں فارغ بالی اور خوش حالی کا سماں اور دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ اہل ہنر خاص کر شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ شعر گوئی فیشن ہو گیا تھا اور شاعر اُمرا اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق اور اُن کی تفریح کا سامان تھے۔ لکھنؤ پہلے ایک بے حیثیت قصبہ تھا۔ اُسے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں عروج حاصل ہوا، اور حکومت کا مستقر فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اب لکھنؤ دلّی کا حریف بن گیا، نئی دولت اور نئی حکومت تھی۔ اہل لکھنؤ نے دلّی کے مقابلے میں اپنی جداگانہ حیثیت قائم کرنی چاہی، چناں چہ لباس میں، کھانوں میں، گفتگو میں، لہجے میں، طرزِ عمارت طبابت حتیٰ کہ شعر و سخن میں نئی تراش خراش اور جدّت پیدا کی۔ اُردو ادب میں اُس وقت سارا زور شعر و شاعری پر تھا۔ نثر کو یہ درجہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ لکھنوی طرز کے موجد ناسخ ہیں۔ اُن کا کلام بے مزہ، بے جان، بے اثر ہے کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ یہی کیفیت ناسخ اور اُن کے تلامذہ اور مقلدوں کے کلام کی ہے جو تصنع و تکلف، صنائع دور از کار تشبیہوں، استعاروں اور تلازموں، عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے بھرا ہوا ہے اور بہت سے روزمرہ کے سبک اور شیریں الفاظ کو اس لیے ترک کر دیا کہ وہ عوام کی زبان ہے۔ ناسخ اور اُن کے خاص تلامذہ نے متروکات کا نام اصلاح زبان رکھا تھا۔ فسانۂ عجائب اور نو طرز مرصع اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

سہ یہ نثر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ صاحب علم اکثر مقفّیٰ مسجع نثر لکھتے تھے اور فارسی عربی الفاظ کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں سادہ بول چال کی زبان لکھی گئی۔ یہ کالج کے انگریز ناظموں کی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ اس

کالج کی بنیاد اٹھارویں صدی کے آخری ایام میں رکھی گئی اور انیسویں صدی کے آغاز میں اُردو کی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ یہ کالج گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے قائم کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اس سے اختلاف تھا۔ آخر کئی سال کی مراسلت اور کش مکش کے بعد توڑ دیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ جدید نثر کا آغاز اس کالج ہی سے ہوا۔ لیکن اس کی عمر بہت کم ہوئی اور چند سال کے بعد بند ہو جانے سے اُردو ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بند ہو گیا اس لیے اس کی کارگزاریوں کا اثر اُردو نثر پر کم ہوا۔ زیادہ تر قصص و حکایات کی کتابیں ترجمہ ہوئیں ان میں سے دو چار زیادہ مشہور اور مقبول ہوئیں۔ تاریخ و مذہب وغیرہ کی بھی دو ایک کتابیں ترجمہ کی گئیں لیکن ان کا رواج نہ ہوا اور ناپید ہو گئیں، البتہ دہلی کالج نے مغربی تعلیم کا شعبہ قائم کر کے اُردو کو تمام جدید علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم بنایا۔ ہندستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ پہلا صحیح قدم تھا جو ملک میں علم کی اشاعت کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ اور مختلف علوم مثلاً طبیعیات کیمیا، تاریخ، قانون وغیرہ کی سو سوا سو کتابیں تالیف و ترجمہ کیں۔ لیکن افسوس کہ چند سال کام کرنے کے بعد اس پر ایک آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کی شورش میں اس کی حالت ابتر ہو گئی اور تعلیم و تعلم کا ولولہ دھیما پڑ گیا۔ بعد میں جب دلّی کا تعلق پنجاب سے ہو گیا تو کالج بھی برخاست کر دیا گیا۔ اُس نے ایک ایسے بے مثل علمی کام کا آغاز کیا تھا کہ اگر یہ سیاسی مدبروں کی ناعاقبت اندیشی سے بچ جاتا اور اس کا سلسلہ جاری رہتا تو اُردو کی پہلی یونی ورسٹی ہوتا۔ فرماں روایانِ وقت کی تنگ نظری اور نااہلی نے ہماری علمی ترقی کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اُس نے جو کام کیا تھا ادھورا رہ گیا اور پھر کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ جو تار جہاں سے ٹوٹا تھا اُسے جوڑتا۔ وہیں چھٹی ہوئی منزل تک پھر سے پہنچنے کے لیے ہمیں پوری ایک صدی لگی۔

یہ دونوں ادارے بے وقت چل بسے اس لیے کہ جن کے ہاتھ میں ان کی موت وحیات تھی، اُن میں کوئی بھی ان کا قدردان نہ تھا۔ لوگ ان کے کارناموں کو بھول بھال گئے اور ان کا اثر جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا نہ ہوسکا۔ انھوں نے جو کچھ کیا بہت قابل قدر ہے لیکن اُردو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے۔ سید احمد خاں نے اس کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی اور اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک خطبے[1] میں لکھا ہے۔ "اُس نے زبان کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جدید علوم وفنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کرکے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ ٹائپ کو رواج دیا۔ ان کی اور ان کے رفقا کی سعیٔ عمل سے علی گڑھ اُردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہوگیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اُردو زبان کے فروغ اور رواج کا زمانہ تھا۔ اور ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔"

سادگی دپرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنے نہیں کہ آسان لفظ جمع کردیئے جائیں ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت

[1] خطبۂ صدارت شعبۂ اردو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ ۔ ۱۶ر فروری ۱۹۳۷ء

ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دل کش ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اُسے سمجھیں، اُس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اُٹھائیں اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہے۔ سرسید کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پراثر اور پُر خلوص تھی۔ معمولی پڑھے لکھے شخص کی سمجھ میں بھی آتی اور اس کے دل میں گھر کرتی۔ ان کے دل میں قوم کا درد تھا اور اس نے اُن کی تحریر میں سادگی اثر اور خلوص پیدا کر دیا تھا۔ یہ اثر رنگین عبارت مقفیٰ مسجع جملوں تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے نہیں پیدا ہو سکتا۔

وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے تھے کہ بعض اوقات ضمیروں کے لانے سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواری ہو جاتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ فلاں ضمیر کا مرجع کون ہے۔ ایسی حالت میں اسم کا اعادہ مناسب ہے خواہ کئی بار دُہرانا کیوں نہ پڑے۔ اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے عبارت کی روانی یا حسن میں فرق آجائے گا مفہوم کا صاف ہونا سب سے ضروری ہے۔ تار لکھنے میں لوگ بڑی خست سے کام لیتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو جائے اس سے وہ بہت ناراض ہوتے تھے اور کہتے دو چار پیسوں کی خاطر مکتوب الیہ کو الجھن میں کیوں ڈالتے ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں ایسا لکھنا چاہتا ہوں کہ میرا سائیس اور گھر کی

ما ما بھی آ سے سنبھلے۔ ایک روز میں مولانا شبلی سے (جب وہ حیدر آباد میں تھے) ملنے گیا۔ مولانا برابر ٹہل رہے تھے اور کسی خیال میں محو تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا مولانا آپ کس سوچ میں ہیں (اس زمانے میں مولانا علم الکلام لکھ رہے تھے) فرمانے لگے "میں اب اس مقام پر پہنچا ہوں جہاں مجھے وحی الہام پر کچھ لکھنا ہے۔ لیکن سیّد احمد خاں نے اس مضمون کو اپنی تحریر سے ایسا پانی کر دیا ہے کہ میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اُسے کس ڈھنگ سے لکھوں" سرسید کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُترتا چلا جاتا تھا۔

سرسیّد نے خود بھی تہذیب الاخلاق کے چار سال کے ختم ہونے پر اپنے اس کام کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اُس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور

ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آ گئی ہے اور اُس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ ادائے مضمون کا بالکل اُٹھتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اُردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان پاس موجود نہیں جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور اُن کے حالات اور جو بحثیں اُن پر ہو چکی ہیں اور جو اُمور اُن کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو۔ اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن اُمور کا تصفیہ ہو چکا ہے اُنھیں کو پھر کہے جاتے ہیں، یہ نقص اُسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کی عموماً اُن پر دسترس ہوگی۔ سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور یہی سبب ہے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اُردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میرؔ و دردؔ و ظفرؔ نے اُردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو کی ہے۔ میر امن نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو۔ جو اس سے زیادہ فصیح و دل چسپ

وبا محاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچّوں کے سُلاتے وقت ان کو کہانی
سُناتی ہو۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہو جو آج تک اُردو زبان میں نہ تھی۔
یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہو۔
اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشائی خیالات کو نہ ملائے گی
جواب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں
بھی میکالے اور اڈیسن کی سی ہو جائیں گی۔"

تین سال بعد وہ پھر لکھتے ہیں کہ:-

"اُردو زبان کا علم ادب جو بدخیالات اور موٹے و بھدّے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہو اُس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں پر بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی قومی عزّت، سلف آنر یعنی اپنے آپ عزّت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہ کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اُردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اُردو علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔"

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تہذیب الاخلاق یعنی سرسیّد کی تحریروں نے قوم میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کی۔ توہمات اور تعصّبات کے مٹانے میں بڑا کام کیا۔ متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا اسی نے سکھایا۔ حقیقت یہ ہو کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وسعت اور ادبی علمی صلاحیت پائی جاتی ہو وہ سیّد کا طفیل ہو۔ یوں تو ان کی ساری عمر

لکھنے پڑھنے اور تالیف و تصنیف میں گزری لیکن جب سے وہ پنشن لے کر علی گڑھ آئے اور کالج کا کام سنبھالا، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق جاری کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، ان کا سارا وقت صبح سے شام تک لکھنے لکھانے ہی میں گزر جاتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے کام نکلتے رہتے تھے، مثلاً سیاست، مذہب، جلسے، اڈریس، تقریریں، رپورٹیں، روئدادیں مراسلت وغیرہ یہ سب کچھ وہ خود ہی لکھتے تھے۔ جو شخص دن رات لکھتا رہے اور اس قدر مختلف شعبوں اور موضوعات پر لکھے اور جسے ایک بار لکھنے یا لکھانے کے بعد دوبارہ دیکھنے یا نظر ثانی کی فرصت نہ ملے اس سے یہ توقع کرنا کہ اُس کی ہر تحریر ادب کا اعلا نمونہ ہو، عبث ہے۔ پھر ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسن بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کی عبارت سُست اور پھُس پھُسی معلوم ہوتی ہے، لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ حُسن بیان، خوبیٔ خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے، اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لطف زبان بھی ہے، مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری ہے وہ دوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن طوالت کے خوف سے معذور ہوں۔ البتہ ان کی

ایک چھوٹی سی تصنیف "سیرت فریدیہ" کا نام لیتا ہوں۔ اس میں انھوں نے اپنے نانا والدہ اپنی تعلیم، قلعہ اور اُس وقت کی سوسائٹی کے حالات بڑی بے تکلفی اور خوبی سے نہایت سادہ عبارت میں لکھے ہیں یہ بڑا اچھا نمونہ ہے کہ ہمیں سوانح اور واقعات کس ڈھنگ سے بیان کرنے چاہئیں۔

اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ انگریزی لفظ آتے ہیں جس کی لوگوں کو شکایت تھی۔ اس کا انھوں نے خود ہی جواب دیا ہے۔

"بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اُردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں۔ مگر ان کو غور کرنا چاہئے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے وہ مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہلِ زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہلِ زبان غیر زبان کے الفاظ ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچے کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہلِ زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ سب اہلِ زبان سے بلکہ صرف اُس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہئے کہ اہلِ زبان کو دوسری زبان کے لفظوں کے لے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اُس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اُسی ملک کی زبان میں قائم رکھے۔ کیوں کہ اگر ان کے لیے اپنی زبان کے الفاظ

اور اصطلاح سے بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہو جائے گی یونانی میں جو تاریخیں غیر ملکوں کی عربی زبان میں ترجمہ نہیں، تصنیف ہوئی ہیں۔ اُن کو دیکھو کہ کس قدر غیر زبان کے الفاظ معرّب اور غیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی اخبار الجوائب کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اُس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہو جاتے تو وہ بھی مثل عبرانی و سنسکرت و ژند کے مُردہ زبان ہو جاتی۔

"علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہو جاتا ہے کہ جس زبان سے اُس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب .... عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ عربی زبان سے کیمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کیمسٹری میں شامل ہیں۔

"پوچھو اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کیمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے کیمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور اُن غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کیمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کیمسٹری کا لفظ اُس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کیمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال پیدا کرے۔"

اُس کے بعد لفظ کی خوبی اور صلاحیت اور غلط اور صحیح پر بحث کرکے لکھتے ہیں۔ "دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف

بڑھانے کے لیے ہوتا ہے، کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اُس مرادف سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی .... پس محبِ قوم اہلِ زبان اُن خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لیے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو۔"

اپنی زبان میں غیر زبانوں کے لفظ لینے کی بحث بہت دلچسپ اور طویل ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔ میں اپنے مضمون "اُردو میں دخیل الفاظ" میں اس پر کافی بحث کر چکا ہوں۔ سرسید کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات ضرورت یا مجبوری سے غیر زبان کے لفظ لینے پڑتے ہیں، یہ زیادہ تر اصطلاحی یا صنعت و حرفت اور سائنس کے لفظ یا اصطلاحات ہوتی ہیں۔ ایسی صنعت و حرفت اور فنون جو اپنے ملک میں نہیں ہوتے، اور غیر ملک سے آتے ہیں تو ان کے ساتھ بہت سے مخصوص لفظ بھی آ جاتے ہیں۔ یا ایسے لفظ یا اصطلاحیں جو اعلام سے منسوب ہوتی ہیں بجنسہ لے لینی پڑتی ہیں۔ دوسری بات اُنھوں نے یہ کہی ہے کہ بعض غیر زبان کے لفظ عظمت اور دل نشینی کی خاطر استعمال کرنے پڑتے ہیں اگرچہ ان کے مترادف اپنی زبان میں موجود ہیں۔ یہ بات کسی قدر صحیح ہے۔ مثلاً سرسید اور ان کے معاصر سویلزیشن کا لفظ استعمال کرتے تھے اگرچہ تمدّن کا لفظ ہمارے ہاں موجود ہے۔ لیکن اس سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہ ہوتا تھا جو سویلزیشن سے ہوتا ہے۔ اب چونکہ ایک مدت سے ان معنوں میں استعمال ہوتا چلا آتا ہے اس لیے سویلزیشن کا قائم مقام ہو گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب

کی نظروں میں سویلزیشن کے لفظ میں جو عظمت اور جاذبیت تھی وہ تمدن میں نہ تھی۔ ان کے سامنے ان معنوں میں تمدن کہا جاتا تو وہ شاید سمجھتے بھی نہیں۔ آج کل مثلاً کلچر کا لفظ ہے اس کے لیے ایک نیا لفظ ثقافت استعمال ہوتا ہے مگر یہ لفظ ثقیل اور نامانوس ہے۔ اس کا مادہ یا اس سے مشتق کوئی دوسرا لفظ ہماری زبان میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ لوگ اس لفظ کو لکھتے تو ہیں مگر مجبوری سے خوشی سے نہیں۔ دوسرا لفظ اس کی جگہ تہذیب کا مفہوم ہماری زبان میں وہ نہیں جو کلچر میں ہے۔ ان دو لفظوں کے ہوتے ہوئے لکھنے والا مطمئن نہیں ہوتا اور نہ کبھی نہ کبھی کلچر لکھ ہی جاتا ہے۔ جب ایک مدت کے استعمال اور رواج سے ان میں سے کوئی ایک لفظ اپنی جگہ بنا لے گا تو وہ کلچر کا قائم مقام ہو جائے گا۔ لیکن ایک محبِ قوم اور مصلح میں بڑی بے صبری اور عجلت ہوتی ہے وہ اتنے دنوں تک انتظار نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے خیالات اور منصوبوں کو جلد سے جلد عمل میں لانا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ معذور ہے اور ہم اس پر گرفت نہیں کرسکتے۔

اردو نظم کے متعلق بھی انھوں نے گاہے گاہے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں میں ان کا صرف ایک قول نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آج سے ۷۰ برس پہلے انھوں نے ردیف و قافیہ و اوزان کی پابندی اور معرا اور آزاد نظم کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا اور جس کا اب کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے، وہ ان کی ادبی ترقی پسندی کا بین ثبوت ہے۔ اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے تھے۔

"ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم ادب میں بڑا نقصان یہ

تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمّت عاشقانہ اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا نہیں وہ بھی عمدہ مضامین ہیں اور جودتِ طبع اور تلاش مضمون کے لیے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھا۔ دوسرے دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ بے ردیف و بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔"

۳۔ سرسید کو فارسی اور اُردُو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی کہ تاریخی اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردُو میں ترجمہ کرائی جائیں اور بقول مولانا حالیؔ کے " اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔" خود بھی دو کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک اُردُو لغات جسے لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا نمونہ اپنے اخبار میں شایع کیا۔ دوسری اُردُو ادب کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے اس وقت تک چھپی ہیں، نام، مصنّف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور اس کی عبارت کے نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ درج ہوگا۔ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس سوسائٹی نے چالیس کتابیں شائع کیں، یہ سراسر اُنھیں کی کوشش اور توجہ کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ وہ دوسرے ایسے ضروری کاموں میں پھنس گئے کہ یہ کام ناتمام رہ گیا۔ البتہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نے اُردُو تحریر اور اسلوب بیان کی اصلاح میں بڑا کام کیا جس سے ادبی شان

بڑھ گئی۔ اور اس وقت جو ہم اپنی زبان میں ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی صلاحیت دیکھتے ہیں وہ زیادہ تر اسی کا فیض ہے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے (جس کے بانی و سکریٹری وہ خود تھے) ایک عرضداشت در بارۂ قیام "ورنیکلر یونی ورسٹی" گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی۔ یہ بڑی اہم دوررس اور اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تھی۔ عرضداشت کی ابتدا میں تعلیم کی غرض و غایت بیان کی ہے اور اس کی رو سے مروجہ طریقۂ تعلیم ناقص اور غیر کافی بتایا ہے۔ "جو گورنمنٹ سوا ان غرضوں اور کسی قسم کی اور شاید اس کمتر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کر ان کو صرف اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہو جائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کچھوانے یا کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھانے میں کرتا ہے۔" اس کے بعد لکھا ہے کہ "تعلیم جواب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے"۔ اس کے کئی باعث ہیں جن میں سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ایک ایسی غیر اور اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی صراحت کی ہے۔ "مگر جس تجویز کو ہم گورنمنٹ اور لوگوں کے غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کر سکتے جو ایک غیر ملک کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے زیادہ تر مناسب ہو۔ کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شائستگی اور فضل و کمال کی

تعلیم ایسی زبان کے ذریعہ سے جس سے وہ ناآشنا ہیں اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندستان مقبوضۂ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیویں بہتر اور عمدہ نہیں ہوسکتی؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جا سکے۔ یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خداتعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کرسکیں جو بابل کے منار پر اس نے دکھائی پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم وفضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھیرایا جائے۔" عرضداشت میں سول انجینیرنگ کالج رڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ کی نظیر بھی پیش کی گئی۔ جہاں شاخ اردو کے طالب علم اردو کے ذریعہ سے تعلیم پاتے ہیں۔ اُن کو وہی کتابیں جو انگریزی میں ہیں اردو میں ترجمہ کرکے پڑھائی جاتی ہیں۔ اردو کے طالب علم اپنے ہم سر انگریزی طالب علموں سے ان مضامین کی تحصیل میں پیچھے نہیں رہتے۔ بعض اوقات اردو فریق کا طالب علم اپنے ہم سر انگریزی طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔

مقصد یہ تھا کہ یا تو اس غرض کے لیے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم وفنون جو کلکتہ یونی ورسٹی میں سکھاتے جاتے ہیں، اس درسگاہ میں دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں، ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں، اور اس کے طالب علموں کو ویسی ہی سندیں دی جائیں جو کلکتہ یونی ورسٹی کے کامیاب طلبہ کو دی جاتی ہیں، یا کلکتہ یونی ورسٹی میں ایک شعبہ اسی غرض اور مقصد سے قائم کیا جائے۔ آخر میں بطور دفع مقدر یہ لکھا کہ "یہ بات البتہ سچ ہے کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی

زبان میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کرسکے جو اب یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے مزود ہوتا ہے لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ جو کتابیں یونی ورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہوسکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں چنانچہ بہت سے عالم فاضل اس کام کے لائق موجود ہیں اور علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی اس کام کو انجام دے رہی ہے۔"

یوں تو گورنر جنرل نے اپنی خوشنودی اور ہمدردی کا بہت کچھ اظہار کیا لیکن جس امر کا اندیشہ تھا اور جس کے رفع کرنے کی عرضداشت کے آخر میں کوشش کی گئی تھی، جواب میں وہی لکھا ہوا آیا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) دیسی زبانوں میں ابھی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں (۲) صرف ان کتابوں کا ترجمہ جو یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہوسکے۔ کیونکہ تعلیم یونی ورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہو جائے بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں علم کی تحصیل کے لیے طبیعت کو مستعد اور تیار کیا جائے۔ اور کچھ عرصے تک غالباً ہندستان کے باشندے انگریزی کے ذریعے سے اس بات کو حاصل کرسکتے ہیں (۳) درصورت پسندیدہ ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندستان ہے کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمے لے۔

اس عرضداشت میں بار بار یہ جتایا گیا ہے کہ اس تجویز سے ہمارا ہرگز یہ منشا

نہیں کہ انگریزی کے ذریعہ سے علوم و فنون کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں کسی قسم کی کمی کی جائے بلکہ اسے ترقی دی جائے۔ ان کا یہ خدشہ وہم کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کہیں گورنمنٹ اس تجویز کی آڑ لے کر انگریزی کی اعلا تعلیم کو بند نہ کر دے یا انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت دے کر سارا زور مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کی تعلیم میں نہ صرف کر دے۔ چنانچہ جب لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات پر جو تقریریں کیں اور اس کے بعد لارڈ رپن نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی ان میں مشرقی زبانوں اور علوم کی تعلیم کو خوب سراہا۔ لارڈ رپن کی تقریر میں یہ الفاظ تھے کہ "ترقی و اشاعت زبان ہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت کار احسن ہے" وغیرہ وغیرہ، تو سرسید کا یہ احتمال قوی ہو گیا کہ گورنمنٹ کی نیت اچھی نہیں اور اگر پنجاب کو یونیورسٹی کا درجہ اور اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلیٰ تعلیم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس بنا پر اُنھوں نے بڑے سخت اور زبردست آرٹیکل اس کی مخالفت میں لکھے۔

اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ الٰہ آباد یونی ورسٹی بھی اسی ڈھنگ پر بننے والی ہے تو انھوں نے اس کی پُرزور مخالفت کی اور لکھا کہ اگر ایسا ہے "تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے۔ استقلال، استقلال، استقلال۔ ہمت، ہمت، ہمت۔ کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں۔" یہی شبہ انھیں اس معاملے میں ہوا اور یہ سن گن پاکر کہ گورنمنٹ کا منشا کلکتہ یونی ورسٹی کو توڑ کر ورنیکولر یونی ورسٹی قایم

کرنے کا ہے اور انگریزی زبان کی اس میں ثانوی حیثیت ہوگی۔ اس سے ان کا جوش دھیما پڑ گیا۔ کچھ اور حالات بھی ایسے واقع ہوئے کہ یہ کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔

"ورنیکلر" سے سرسید اور اُن کے رفقا یعنی ارکانِ برٹش انڈین ایسوسی ایشن و ارکان سائنٹفک سوسائٹی کی (جس میں ہندستانی اور انگریز سب شریک تھے) مراد اُردو زبان تھی۔ کیونکہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہو سکتی، عرضداشت کے اس فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے جس میں سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے قبل اس کا تجربہ دہلی کالج میں ہو چکا تھا جہاں سب علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور جتنے ترجمے اور تالیفات وہاں ہوئیں وہ سب اُردو میں تھیں، نیز سول انجینیرنگ کالج رڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ میں اُردو فریق کے طلبا کو نصاب کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کرکے پڑھایا جاتا تھا۔ گورمنٹ کی طرف سے جواب آنے پر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندستانیوں مثلاً مولوی ذکاءاللہ، ماسٹر پیارے لال، پنڈت دھرم نرائن نے انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی۔

ملک کی بدنصیبی دیکھیے کہ ابھی یہ تجویز معرضِ بحث میں تھی اور اس کی منظوری اور عمل میں آنے کی بھی کچھ زیادہ توقع نہ تھی کہ زبان کے معاملے میں اختلاف شروع ہو گیا اور اخباروں میں ہندی اُردو کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ہندی والے خود بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہندی میں اس قسم کے ترجموں کی صلاحیت نہیں ہے تاہم وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اسے ترقی دینے کی کوشش کرکے ترجمہ کے قابل بنایا جائے اور اس یونی ورسٹی میں مسلمانوں کو اُردو میں اور ہندوؤں کو ہندی میں تعلیم دی جائے

کیا یہ دو قومی نظریہ نہیں ہے؟

اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی گئی۔ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کی ایک منتخب کمیٹی میں ایک بڑی طویل تجویز تعلیم مسلمانان کے متعلق پیش کی۔ اس میں مدستہ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے قایم کرنے کا بھی ذکر تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ "یہ درحقیقت تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اول انگریزی، دوم اردو، سوم عربی فارسی" اردو مدرسے کے متعلق یہ تجویز پیش کی:۔

"اس میں تمام علوم و فنون بزبان اردو پڑھائیں گے۔ اور جو کچھ تعلیم اس میں ہوگی وہ سب اردو میں ہوگی۔ البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں میں سے ایک زبان بطور سکنڈ لینگوج کے اختیار کرنی ہوگی، انگریزی، فارسی، عربی۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو لڑکا دس بارہ برس کی عمر میں اس مدرسہ میں داخل ہوگا وہ ضرور اٹھارہ برس کی عمر تک تمام سائنس یعنی علوم کو اردو زبان میں اس قدر تحصیل کرلے گا جس قدر کہ درجۂ بی۔ اے کے لیے مقرر ہیں........ یہ مدرسہ جو اس قسم کا تجویز کیا گیا ہے جس میں تمام علوم اردو زبان میں پڑھائے جائیں گے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل ان کو غیر زبان کا سیکھنا اور دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کا سیکھنا ہوتا ہے۔ پس اس تدبیر سے ہم نے ان کی ایک مشکل کو موقوف کر دیا ہے تاکہ وہ بہ سبب اپنی زبان کے علوم و فنون سے نہایت جلد بخوبی واقف ہو جاویں اور بعد اس کے دوسری زبان کے لٹریچر میں محنت کرکے جہاں تک ان سے ہو سکے ترقی کرلیں۔ اس تدبیر سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت کم طالب علم علوم و فنون سے گو کہ وہ اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہوں

ناواقف رہیں گے اور بہ نسبت حال کے لٹریچر پر محنت کرنے کی زیادہ مہلت ملے گی اور اُن کو اس زبان کی لٹریچر بہ نسبت حال کے بہت زیادہ آجائے گی۔"

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ آگے چل کر یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی اور اس تجربہ کا موقع نہ ملا۔ مگر اس سے بہر حال ان کے اس خیال کا کافی اندازہ ہوتا ہی کہ وہ اُردو کے ذریعہ سے تعلیم دینا کس قدر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بحث آئی کہ کیا وجہ ہی کہ ہندستان کے کالجوں کی تعلیم سے وہ لیاقت حاصل نہیں ہوتی جو انگلستان کے کالجوں کی تعلیم سے ہوتی ہی۔ اس کا جواب سرسیّد نے یہی دیا کہ وہاں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہی اور یہاں ایک غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہی جس پر قدرت حاصل کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہی اور "اس پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم و فنون کا گزر جاتا ہی۔"

اُردو کی حمایت میں سرسیّد نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ جب کبھی اُردو پر آنچ آتی دیکھی تو وہ اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ ۱۸۶۷ء میں بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں اور مدرسوں سے اُردو زبان اور اُردو رسم خط کو خارج کرنے اور اس کی بجائے ہندی بھاشا اور ناگری رسم خط رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے سال اس غرض کے لیے جا بجا کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں قائم ہوئیں اور صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی اور بابو سرودا پرشاد سنڈیال اس کے سکریٹری بنائے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اس پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، بنارس گزٹ، رسالہ جلسۂ تہذیب لکھنؤ، ایجوکیشن گزٹ، نور الابصار وغیرہ میں دونوں

طرف سے سخت اور پُر جوش مضامین شائع ہوئے اور اچھا خاصا مناظرے کا رنگ پیدا ہو گیا۔ بابو سرود اپرشاد اور سید احمد خاں میں اس موضوع پر مراسلت بھی ہوئی۔

ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ بہار میں بم کا گولہ پھٹا۔ ۱۰ نومبر ۱۸۷۱ء کو مظفرپور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مسٹر جی کیمبل لفٹنٹ گورنر بنگال کو مدعو کیا گیا۔ اُن کے آنے پر تین تقریریں ہوئیں۔ مولوی سید امداد علی نے اُردو میں اور ڈاکٹر فیلن اور کیمبل نے انگریزی میں تقریر کی ظاہر ہو کہ سپاس ناموں میں اور اس قسم کی مدحیہ تقریروں میں عربی، فارسی الفاظ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس پر لفٹنٹ گورنر نے مولوی سید امداد علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ چونکہ میں اس زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کر سکا کہ ان کی تقریر اُردو زبان میں تھی یا فارسی میں۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اُردو دیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو ایک عجیب وغریب سرکاری یادداشت شائع کی جو جہالت و تعصب اور بدتمیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"فارسی زبان کو جو ہندستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی ترک کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کر دی گئی تھی۔ میری ملازمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشاپردازوں کو بہت عزیز تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ زبان

متروک ہوچکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے الفاظ استعمال ہورہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں جو زبان میں نے سُنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس زبان کے لیے اُردو کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے، یہ ایسا لفظ ہے جس کے معنے متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کچھ لکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان اہل دربار اور دلّی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروّجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے، روکنے کی کوشش کروں گا۔ میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پُرتکلف زبان ہے۔ اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں۔ لیکن بگڑی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل جول سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندستانی کے کچھ تھوڑے سے افعال و حروف ہجائیہ شامل کر لیے گئے ہیں جسے اُردو کہتے ہیں، ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جائے .... مصنوعی زبانیں سکھلانے سے کچھ فائدہ نہیں جنھیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

میں ڈائرکٹر تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل اُمور کی طرف مبذول کراتا ہوں:-
(۱) اُردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہو چکی ہے۔ (۲) ڈائرکٹر تعلیمات اور انسپکٹرانِ مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے" وغیرہ وغیرہ۔
آخر میں لکھتے ہیں -" میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دفاتر میں سوا مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ کریں، الاّ انگریزی زبان کے۔ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہ علیٰ حالہٖ رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے"

یہ شخص اُردو کو دوغلی زبان کہتا ہے حالانکہ اُس کی مادری زبان دُنیا بھر کی زبانوں میں سب سے زیادہ دوغلی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ (یہ میرا قیاس ہے) کہ ڈاکٹر فیلن انسپکٹر مدارس اور اینٹنی میکڈانل نے جو اُس وقت بہار میں کلکٹر تھے۔ لفٹننٹ گورنر کے کان بھرے۔ یہ دونوں ہندی کے حامی تھے۔ ڈاکٹر فیلن نے اپنی ہندوستانی ڈکشنری میں ڈھونڈ ڈھونڈ اور چُن چُن کر اور اپنے گماشتوں کے ذریعہ تلاش کروا کر بڑے اہتمام سے فحش اور سوقیانہ الفاظ اور محاورے جمع کیے ہیں۔ یہی نہیں کہ جو لفظ درحقیقت فحش ہیں وہی لکھے ہوں بلکہ ایسے معمولی روزمرّہ کے لفظ اور محاورے بھی جو مجازاً، کنایۃً، طنزاً یا کسی نہ کسی صورت سے فحش معنوں میں آسکتے ہیں، اُنھوں نے بڑی باریک بینی سے ایسے معنے بھی درج فرما دیئے ہیں۔ مقصد اُردو کو سوقیانہ زبان ثابت کرنا اور بدنام کرنا تھا۔ دوسرے اینٹنی میکڈانل وہ بزرگ ہیں کہ جب وہ یو پی کے لفٹننٹ گورنر ہو کر آئے تو سب سے

پہلے اُردو پر ہاتھ صاف کیا۔ اُن کے عہد حکومت کا بڑا کارنامہ یہی ہے۔ غرض مسلمانوں اور بعض پرانی وضع کے ہندوؤں نے بہت کچھ واویلا کی مگر شنوائی نہ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور ہلچل مچانا نہ پہلے آتا تھا اور نہ اب آتا ہے اس لیے ہمیشہ خسارے میں رہے۔

جب سر سید نے دیکھا کہ بات بڑھتی جا رہی ہے اور ہندو اپنی کوششوں میں برابر لگے ہوئے ہیں تو الہ آباد میں ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اُردو کی حمایت میں ایک جلسہ ہوا۔ اور ہندی کی تحریک کو روکنے کے لیے ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں بنائی گئی جس کے سکریٹری سید احمد خاں قرار پائے۔ صدر کمیٹی کی طرف سے ایک سرکلر صوبہ شمال مغرب کے ہر ضلع میں بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ اس سرکلر میں اُن نقصانات کی تفصیل تھی جو اُردو کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی کو رائج کرنے سے ہوں گے۔ نیز اس جلسے میں ایک تجویز یہ ہوئی کہ ہر ضلع میں ماتحت کمیٹیاں اس غرض سے بنائی جائیں۔ مسلمانوں کی طرف سے تو اس معاملہ میں کچھ زیادہ جوش خروش کا اظہار نہ ہوا، لیکن الہ آباد کی ہندی صدر مجلس نے منظم طور پر اپنی کوششوں کو شدو مد سے جاری رکھا اور ہزارہا ہندوؤں کے دستخطوں سے بڑے بڑے محضر گورنمنٹ میں پیش کیے۔ ڈائرکٹر تعلیمات نے اس کمیٹی کی تائید کی مگر اُس وقت اس بنا پر کچھ کامیابی نہ ہوئی کہ اُردو زبان اور اس کا رسم خط ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم خط کی نسبت بہت زیادہ مروج تھا۔

سر سید نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب قومی خدمت شروع کی تو جتنے کام کیے اُن میں کبھی ہندو مسلم کا امتیاز نہ کیا اور نہ کبھی اس کا خیال آیا۔ مثلاً مُرادآباد اور غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔ سائنٹفک سوسائٹی قایم کی اور اس قسم کے جو جو کام کیے وہ سب کے لیے تھے اور ان میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے

شریک تھے۔ اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بارہا اس خیال کو بڑے خلوص اور پُر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں صرف دو ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔

"اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیئے۔" (تقریر گورداسپور ۲۷؍ جنوری ۱۸۸۳ء)

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں اس کہنے کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیوں کہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے۔ مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک آنکھ ہی ہوتی کہ اس حالت میں میں عمدگی کے ساتھ ان کو اس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہ دے سکتا۔"

"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوب صورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔ اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائیگی۔ پس اے ہندستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو

اُس دُلہن کو بھینگا بنا دو چاہو کانڑا۔"

" ہندُستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ ایک دریا کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہے دونوں کا علٰحدہ علٰحدہ رہنا دونوں کو برباد کر دینا ہے۔"

" اب ہندُستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی دونوں پیتے ہیں۔ ہندُستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندُستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی۔"

" میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں کہ اُن کا (یعنی ہندو مسلمان کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے، کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں، یہی مختلف وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کی جو ہندُستان میں آباد

ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندستان کی رہنے والی قوم۔"

ان اقوال سے ظاہر ہو کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کس قدر حامی تھے۔ تقریر وتحریر میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے بوئے تعصب آتی ہو یا ہندوؤں کی دل آزاری کا باعث ہو، بلکہ ان کے بزرگوں اور لیڈروں کا ذکر ہمیشہ ادب واحترام سے کیا اور ان کے مرنے پر کمال رنج وافسوس کا اظہار کیا۔ اپنی تقریروں اور مضامین میں باربار باہمی اتحاد کی تلقین کی اور یہ سمجھایا کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہو کہ وہ اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور بھائی بھائی کی طرح مل کر کام کریں۔ گائے کی قربانی کا معاملہ ایسا ہو جس کی وجہ سے ہندستان میں جگہ جگہ دنگے فساد اور خون خرابہ ہوا اور اب تک یہ جھگڑا چلا آرہا ہو۔ مسلمان اسے اپنا مذہبی حق سمجھتے ہیں اور اس میں مداخلت یا ممانعت کو گوارا نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے نہایت صاف دلی اور آزادی سے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت بہتر ہو اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہو۔ یہ صرف خالی خولی زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ چنانچہ ایک سال بکرید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لیے خریدی۔ عین بکرید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہو۔ یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہو گئے۔ فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ایک ڈاک لگا دی، یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس کر دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آیندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطے

میں کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔ اس سے بڑھ کر صلح جوئی اور آشتی پسندی کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اُردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی تو سر سید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی اور بہت صدمہ ہوا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

اپنے اس خیال کو انھوں نے علی گڑھ کی تعلیمی سروے رپورٹ میں بھی ایک جگہ ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش

تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے اُس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت دُرستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اُس کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے۔"

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہندو مسلم نزاع یہیں سے شروع ہوتی ہے اور دو قومی نظریہ کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلم تنازع سیاسی ہے اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کر کے اس کی بنیاد ڈالی۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اُس کی بنیاد اس وقت پڑی جب ہندوؤں نے اُردو کو مٹانے کی کوشش کی، اور یہ کوشش برابر جاری رہی۔ چناں چہ جب سر انٹونی میکڈانل جو بہار میں گُل کھلا چکے تھے یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے تو ہندی والوں کی بن آئی اور یاسی کڑھی میں پھر اُبال آیا۔ اس واقعہ کو مولانا حالی نے حیات جاوید میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں اُنھیں کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

" مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی۔ سر انٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب واودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہری میں بجائے اُردو زبان اور فارسی رسم خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔

اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں اُنھوں نے اس مضمون پر آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اُس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے جس طرح وہ ہندستان کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معاشرت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ ان کی تنگ دلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اُردو کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو بھی ادا کیے بغیر نہ رہے۔ وہ اپنے آرٹیکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اس وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے لفٹننٹ گورنر بہادر اُس زمانے میں جب کہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بہ عوض اُردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر اور مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اُسی پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکرا سمجھتی ہے۔" اس کے بعد انھوں نے میموریل کے خلاف اُردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح کی دلیلیں پیش کی ہیں۔

اگرچہ اس وقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر جو کچھ انھوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا تھا کہ آئندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸ر اپریل ۱۹۰۰ء کو وہ مشہور ریزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹنی میکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔"

یہ صرف میکڈانل کے عہد جبروت ہی کو نہیں یاد دلاتا بلکہ اس نے ہندوؤں کے دو قومی نظریہ پر بھی مہر ثبت کر دی۔ ڈیپوٹیشن کو جواب دیتے ہوئے "ہز آنر نے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کر کے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔" مطلب صاف ظاہر ہے کہ گھبراؤ نہیں، در اجابت باز ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ نیرنگی تقدیر سے جو اس کی جان کے لاگو تھے وہی اس کے آقا بن گئے اور انھوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کسی زمانے میں بدھ مت والوں اور ان کی زبان پالی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ سنت قدیم ہے۔

سرسید اُردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہ کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔ لیکن علمی و ادبی اعتبار سے بھی اُردو زبان میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ان کا ذوق ادب ایسا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑتے تو اُردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے، اب بھی اگر ان کی ضخیم تصانیف اور بے شمار تحریروں میں سے صرف ادبی نقطۂ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو

یہ انتخاب ہماری زبان وادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے قیام سائنٹفک سوسائٹی کے بعد انھیں اُردو لغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں میں تو اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حسن بیان کے چکارے، ٹھیٹ زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح وظرافت کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی، لیکن جب کبھی اپنے روزمرہ کے اشغال وافکار سے فارغ ہوتے، خصوصاً رات کے کھانے کے بعد کوئی علمی یا ادبی گفتگو آجاتی تو اس میں بھی بعض اوقات کوئی نکتے کی بات کہہ جاتے تھے۔ ایک دن مولانا شبلی نے قرآن مجید کا کوئی لفظ یا جملہ (افسوس اس وقت مجھے بالکل یاد نہیں رہا) پڑھا اور کہا کہ شاہ عبدالقادرؒ نے اس کا کیا اچھا ترجمہ کیا ہے " اور بات تو یہ ہے" سیّد صاحب نے فرمایا اس سے بھی مختصر اور بہتر ہو سکتا ہے۔ مولانا نے پوچھا وہ کیونکر۔ فرمایا "اور ہے تو یہ" مولانا قائل ہو گئے۔ ایک بار ظفر اور ذوق پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پرانی بحث دُہرائی گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں سیّد صاحب اس پر ذرا چیں بجبیں ہوئے اور فرمایا کہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آگئی۔

مولوی عبدالرزاق (مصنف البرامکہ) اپنی کتاب "یادایام" میں لکھتے ہیں "سرسیّد کی صحبت نہایت دلچسپ ہوتی تھی شب کے کھانے پر نہایت اطمینان سے گفتگو ہوا کرتی تھی......... مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع سلاطینوں آئی تھی۔ اس پر میرے دوست نے داغ کا مضحکہ اڑایا۔ سرسیّد سن کر چُپ ہو رہے۔ جب دوبارہ یہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے

لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعۂ معلّٰی کی اصطلاح کے مطابق) دوسرے معنے مراد ہیں۔ تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمائیے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموری شہزادے قلعۂ معلّٰی میں تھے ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا۔ اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے۔ داغ نے قلعۂ معلّٰی میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی، لہٰذا اس کا کلام مستند ہے۔"

سرسید بلا کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ اخبار اور تہذیب الاخلاق کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ کالج کے حساب کتاب اور دوسرے اہم کاموں اور عمارتوں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ رپورٹیں تیار کرتے اور ایڈریس لکھتے، لیجس لیٹو کونسل کی ممبری کے زمانے میں تقریریں تیار کرتے۔ خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے۔ ملاقاتیوں سے ملتے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسرے جلسوں کا انتظام کرتے۔ کس کس کام کا ذکر کیا جائے۔ کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صبح سے لے کر شام تک برابر کرتے رہتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانے میں بھی ان کے انہماک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق آسے اور آبھارے۔ ورنہ کام کام نہیں رہتا بیگار ہو جاتی ہے۔ سرسید کا یہی حال تھا کہ وہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تن دہی سے کرتے تھے گویا ان کی دنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہے۔ ہمیں بہت سے

بڑے بڑے لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو لیکن سید کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا تھا۔ ملاقاتیوں سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔ جمع خرچ کی جانچ بھی ہو رہی ہو۔ علمی کام بھی ساتھ ساتھ ہو رہا ہو۔ بجٹ بھی مرتب کیا جا رہا ہو۔ خط بھی لکھے یا لکھوائے جا رہے ہیں ہنسی چہل کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ پروف بھی پڑھ رہے ہیں مضمون بھی لکھوا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہو لیکن پیشانی پر میل نہیں آتا۔ ایک بات پر مجھے بڑی حیرت تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں لیجس لیٹو کونسل کا ممبر انتخاب کیا تھا۔ کونسل میں تمام تقریریں انگریزی میں ہوتی تھیں اور یہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ کونسل کے معاملات کے تمام کاغذات جو سراسر انگریزی میں ہوتے تھے پڑھوا کر اور ترجمہ کروا کر سنتے اور ان کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرتے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کونسل میں جا کر انگریزی میں تقریر کیونکر کرتے تھے۔ اس کی انھوں نے عجیب ترکیب نکالی تھی۔ پہلے وہ اپنی تقریر اُردو میں لکھتے اس کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کراتے پھر اس انگریزی تقریر کو اُردو حروف میں لکھتے اور کونسل میں جا کر پڑھ دیتے۔ یہ کام ایسا بے مزہ اور اکتا دینے والا تھا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن وہ اس سے مطلق نہ گھبراتے۔ لطف یہ ہو کہ یہ تقریریں معمولی اور وقت گزارنے کے لیے نہیں تھیں۔ ان میں بعض بڑے معرکہ کی تھیں۔ ایک بار جب کونسل کے اجلاس کے ختم پر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو لارڈ ڈیٹن ان کے پیچھے پیچھے چلے آئے اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ " میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی تھی "۔

قومی خدمت میں منہمک ہونے سے قبل بھی ان کا یہی حال تھا، اُن کی

اخلاقی جرأت آزادیٔ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصّبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب قائل تھے۔ جس کام کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اُسے کامل خلوص اور تن دہی سے انجام دیا۔ جب قومی خدمت کا بار اپنے سر لیا تو یہ شغف اور بڑھ گیا۔ اِس دھن میں وہ سب کچھ بھول گئے۔ فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انھیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے یہی ان کا درد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سیّد نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سیّد، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سیّد نے اسے "نیشن" کا ہم معنی بنادیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصوّر پیدا کیا۔

شروع میں ایک مدّت تک وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم کہتے اور سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے بار بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں کیا ہے۔ لیکن جب ہمارے ہندو بھائیوں نے اُردو کی مخالفت کرکے دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی تو انھیں سخت رنج ہوا اور انھوں نے ناچار اپنی کوششوں کا رُخ مسلمانوں کی فلاح و تعلیم کی طرف پھیر دیا۔ یہیں سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہوگئیں۔ ہندو سماج کا عمل دو قومی کیا صد قومی نظریے پر ہے۔ میرے مرحوم دوست سیٹھ یعقوب حسن جو کانگریس کے اوّل درجے کے پرستاروں اور لیڈروں میں سے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ جب یہ معلوم ہوا کہ مسٹر گوکھلے مدراس تشریف لانے والے ہیں تو میں نے انھیں ایک بڑے ہوٹل میں ڈنر دینے کی سوچی، اور اس تجویز کو اپنے احباب کے سامنے پیش کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سب سے زیادہ مشکل مجھے ہندو احباب کو رضامند کرنے میں پیش آئی۔ جب میں نے اُن سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ

حیرت سے میرا منہ تکتے تھے کہ یہ کیونکر ممکن ہو کہ سب ایک میز پر ایک ساتھ کھانا کھائیں۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ کھانے میں گوشت یا کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس سے ہندوؤں کو پرہیز ہو۔ پکانے والے بھی ایسے ہوں گے جن کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کے کھانے میں کسی ہندو کو عذر نہ ہوگا۔ غرض بار بار کے سمجھانے بجھانے اور بحث و تکرار کے بعد کچھ تو رضامند ہو گئے اور کچھ نے یہ کہا کہ کھانے کے وقت ہم باہر بیٹھے رہیں گے اور جب کھانا ختم ہو جائیگا تو اندر آ جائیں گے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھے۔ خیر سے یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب تھے۔ مرحوم کہتے تھے کہ جب ڈنر کا دن آیا تو جگہ جگہ سے ٹیلیفون آئے کہ ڈنر کے وقت کیسے کپڑے پہنیں اور کیا کیا پہنیں۔ میں ایک ایک کو سمجھاتا اور بتاتا تھا مگر بعض اس پر بھی نہ سمجھے تو میں نے اُن کے گھر جا جا کر اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے۔ اب ڈنر شروع ہوا۔ ایک گروہ باہر بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہا۔ ڈنر ختم ہوتے ہی یہ مقدس جماعت دبے پاؤں ہال میں براجمان ہوئی۔ لیکن کم بختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ابھی بیٹھنے ہی پائے تھے کہ اتنے میں آئس کریم آئی اور ہر ایک کے سامنے رکھی گئی۔ یہ حضرات بہت جز بز ہوئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کچھ کھس پھس بھی ہوئی۔ بہت بُرے پھنسے، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ بعض نے شرما شرمی دو ایک دو چمچے زہر مار کی۔ باقیوں نے چھوئی تک نہیں اور آنکھیں نیچی کیے بیٹھے رہے۔ اب انھیں کون قوم کہہ سکتا ہو؟ یا کوئی دوسری جماعت ان سے مل کر قوم بننے کا شرف کیوں کر حاصل کر سکتی ہو؟ یہ دوسروں کو مٹا دینا یا ہضم کرنا جانتے ہیں۔ بیچ کا کوئی رستہ ان کے ہاں نہیں ہو۔

سرسید نے ہندو مسلم اتحاد قایم رکھنے اور مل کر کام کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد بھی مسلم لیڈروں نے اس خیال کو ترک نہیں کیا اور کامل

خلوص اور رواداری سے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیتے رہے۔لیکن آخر ہندوؤں کی ناروا داری اور تنگ نظری سے تنگ آکر یکے بعد دیگرے سب الگ ہو گیے۔اور ان کو بھی وہی کہنا پڑا جو سید نے مجبور ہو کر کہا تھا۔ یہ ہندستان کی تاریخ میں نہایت المناک سانحہ ہے اور ناروا داری، سیاسی ناداری اور کوتہ اندیشی کا سب سے بڑا واقعہ۔

دلّی میں سرسید کا خاندان بہت شریف اور عالی خاندان تھا۔اُس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہیئیں۔گھر میں ان کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسلامی اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اُس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے ان کے دل میں بٹھادیئے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے، اور اُن پر عامل رہے۔بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اُس زمانے کے بہترین افراد تھے۔ ان میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ان کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزّت سے لیے جاتے ہیں۔اگرچہ اُن کی تعلیم اعلا درجے کی نہیں ہوئی تھی لیکن تربیت اور صحبت بڑی چیز ہے۔علم سے لگاؤ تھا۔اہل علم اور ارباب سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔غور و فکر اور نکتہ رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ان سب کے بل پر اُنھوں نے وہ وہ کام کیے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

سرسید کے خاندان کا تعلق قلعہ سے ایک زمانے سے چلا آرہا تھا۔قلعہ سے جو تنخواہیں ان کے والد کو ملتی تھیں اُن سے اچھی خاصی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ لیکن حالات بدل گئے تھے۔ان تنخواہوں میں کتر بیونت شروع ہوئی اس لیے اُن کو قلعہ سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اور سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔

اس وقت ان کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی۔ ابتدا میں انھیں معمولی خدمت ملی لیکن وہ اپنی لیاقت اور محنت سے برابر ترقی کرتے چلے گئے اور گورنمنٹ اور پبلک دونوں میں نام پایا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا ملازمت کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف اور تحریکیں اسی زمانے کی ہیں۔ اب کام اتنے پھیل گئے تھے کہ ان کے لیے بہت فرصت درکار تھی۔ دوسرے سرکاری ملازمت کی وجہ سے بعض کاموں کی انجام دہی میں احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ لہٰذا ۱۸۷۶ء میں پنشن پر خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ اور اس عظیم الشان قومی خدمت میں لگ گئے جس کی دھن ان کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔

شروع شروع میں جب مدرسۃ العلوم قایم ہوا اور لڑکے جماعتوں میں داخل ہوئے تو سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ جب صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ دیکھنے کو جاتے تو بچوں کے کمروں میں بھی پہنچتے۔ ان سے باتیں کرتے، پڑھنے لکھنے کا حال دریافت فرماتے۔ مزاح بھی کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ وہ ان کے اکثر بزرگوں سے واقف تھے اور بہت شفقت فرماتے۔ لڑکے جب انھیں آتا دیکھتے تو سنبھل کے بیٹھ جاتے یا کوئی کتاب پڑھنے لگتے۔ کبھی کبھی وہ یونین کلب میں ڈی بیٹ (مباحثہ) کے روز بھی آتے اور کسی ایک پارٹی کی طرف سے تقریر کرتے۔ ایسا دن خوش قسمتی سے شاذ ہی آتا تھا۔ جو طالب علم اچھی تقریر کرتے یا علمی و ادبی ذوق رکھتے اُن سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ علمی کام بھی لیتے۔

سر سید نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا۔ یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار فیصلہ کرلنے کے

بعد اُسے عمل میں لانے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ کیسی کیسی مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، طعن تشنیع، لعنت ملامت سہی اور کیسی کچھ کھکیڑیں نہ اُٹھائیں، لیکن نہایت استقلال اور عالی حوصلگی سے اپنے خیال پر جمے رہے اور جو سوچا تھا اُسے کرکے چھوڑا۔ مگر آخر آخر میں وہ اس کے نتائج سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ آخر بار جب وہ ۱۸۹۴ء میں پنجاب گئے اور اہلِ پنجاب نے بہ مقام جالندھر انھیں اڈریس دیا تو اس کے جواب میں اُنھوں نے صاف صاف کہا کہ "یونی ورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونی ورسٹی کے تابع ہیں اور اُس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا علم کا دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُسی وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونی ورسٹیوں کی غلامی سے آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونی ورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ہمیں صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو میں خود بھی اُنھیں میں ہوں کیونکہ مجھے بھی ایک یونی ورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔" یہ ایسی سچی بات ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ابتدا میں ان کا ارادہ یونی ورسٹی ہی قایم کرنے کا تھا لیکن حکومت وقت نے اُس کی تائید نہ کی۔ اس زمانے میں یونی ورسٹی تو کیا ایک اچھا کالج بھی حکومت کی تائید بغیر چلا نا محال تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ کالج جسے اُنھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا

یونیورسٹی تو بن گیا مگر ان کا منشا پورا نہ ہوا۔ اب تو اس کی توقع خیال خام سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کالج نے جو نئی بیداری اور قومی جذبہ پیدا کیا اُسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ سرسید کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاق حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے۔ وقت پر کسی حاجتمند کی حاجت روا کر دے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے۔ یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان ہو"۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کو اپنا درد دُکھ سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

می تواں قطب زماں شد می تواں شد غوث وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بہ جز انساں شدن!

چیست انسانی تپیدن از تپ ہمسائگاں
از سموم نجد در باغ عدن پژماں شدن

خوار دیدن خویش از خواریٔ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطرتی طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسّر آتے ہیں۔ لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دُکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے اور ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق صرف و نحو و منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت ہے کہ ان بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا نبی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دُکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہ نمائی کا کام دیں گے۔ اُن کی قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔

سرسید کی ہستی بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق مل سکتے ہیں، ان کا اپنا نصب العین پر آخر دم تک جمے رہنا، اس کے لیے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا، مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا، محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا، دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے ان کی ذات یا اُن کے مقصد کو نقصان

پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیا وی اعتبار سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

سرسید بڑے فیاض اور سیر چشم تھے۔ غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفاء کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ داہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ نیک اور ثواب کے کاموں میں مسجدوں کی تعمیر میں بھی اُنھوں نے بڑی فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا۔ غدر کے بعد خانماں برباد پریشان حال مسلمانوں کی طرح طرح سے دستگیری کی۔ خصوصاً ان بے گناہ مسلمانوں کے لیے جن پر بغاوت کے الزام لگا کر سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں، بہت جدوجہد کی، تحقیقاتیں کرائیں، ثبوت بہم پہنچائے اور الزام سے بری کرایا۔ ان فیاضیوں کی بدولت آمدنی سے ان کا خرچ زیادہ رہا اور تنگ دست رہے۔ لیکن جب کالج کی دُھن ان کے سر پر سوار ہوئی تو شخصی فیاضی اور بذل وسخا سے ایک دم ہاتھ اُٹھا لیا۔ اب جو کچھ تھا کالج کے لیے۔ اپنا تو خیر جو کچھ تھا وہ سب کالج کو پونج دیا، مگر مشکل یہ تھی کہ دوسروں کی جیبوں پر بھی اُن کی بڑی کڑی نظر تھی۔ چندہ لینے کے کیسے کیسے نئے ڈھنگ نکالے تھے۔ کسی موقع پر چوکتے ہی نہ تھے۔ علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دُکان لگائی اور خود دُکان پر بیٹھ کر کتابیں بیچیں۔ کسی کے بیٹا پوتا پیدا ہوا یہ چراغی مانگنے کے لیے موجود۔ کہیں سیادت کے دعوے سے امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے جا پہنچے۔ کسی نے دعوت کی تو دعوت کے بدلے روپیہ وصول کر لیا۔ نشنل ایٹیر

بن کر گلے میں جھولی ڈالی، اور انتہا یہ ہے کہ ڈراما کر کے اسٹیج پر آئے اور غزلیں گائیں۔ کبھی اس کا خیال نہ کیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس چندے سے دوست آشناؤں کی جان عذاب میں تھی۔ خدا ان کی مغفرت کرے وہ یہ بدعت اپنے پیچھے ایسی چھوڑ گئے ہیں کہ آج تک اس سے نجات نہیں ملی۔ بلکہ حضرت چندہ کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے اور اب تو عالمگیر ہو گیا ہے۔ اگر سرسید کے چندہ لینے کے طریقوں اور ترکیبوں کی تفصیل لکھی جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔

وہ کم آمیز اور دیر آشنا تھے۔ لیکن جس سے جو تعلق ہو گیا اُسے آخر دم تک نبھایا۔ اور دوستوں کے تو وہ عاشق تھے۔ مولوی سید مہدی علی (نواب محسن الملک) اور سید زین العابدین کو جو خط لکھے ہیں انھیں دیکھئے ایک ایک لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکتی ہے۔ ایسے خط آپ کو شاید ہی کہیں اور ملیں۔ یہ اُن کے دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہی حالت کم و بیش دوسرے احباب کے ساتھ تھی۔ وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے تھے اور جب کبھی ان کے کسی دوست کا انتقال ہو جاتا تو انھیں سخت صدمہ ہوتا اور کئی کئی دن سوگ مناتے تھے۔ وہ دوستی کے مقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے، تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ انھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اترتی اس پر عمل کرتے۔ تقلید کے مطلق قائل نہ تھے، جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ خود وہ کئی ایسی بدعتوں اور

جدتوں کے بانی ہوئے کہ مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے مخالفتیں ہوئیں، مطعون ہوئے، مردود ہوئے، مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی، اپنی بات پر اڑے رہے۔ طوفان آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ لیکن ایک دوستی کے معاملے میں قدامت پرست تھے۔ چندے کی زد ہمیشہ دوستوں ہی پر پڑتی تھی نئے نئے فنڈ قائم کرتے تھے اور سب سے پہلے فہرست میں دوستوں کے نام لکھتے اور خود ہی رقم تجویز کرکے ہر ایک کے نام کے سامنے لکھ دیتے۔ طوعاً وکرہاً دینی ہی پڑتی۔ چندوں سے ان کا ناک میں دم تھا۔ بعض بے تکلف دوست بہت جھنجھلاتے اور بگڑتے مگر سید صاحب کبھی بُرا نہ مانتے۔ اُن کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ لوگ فوراً پسیج جاتے اور جو مانگتے نذر کر دیتے۔ یہ خیر ہوتا ہی رہتا تھا لیکن وہ دوستوں سے اس بات کی بھی توقع رکھتے تھے کہ قومی ہمدردی کے متعلق اُن کے سب تجویزوں میں ان سے اتفاق کریں۔ وہ عمر بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور یہ ان کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی لیکن دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پُرانے وقتوں کی دوستی تھی پُرانے بزرگ اسی پر عامل تھے، دوست کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وہ ادبدا کے اس کا ساتھ دیتے اور مدد کرنے، لڑنے، مرنے، جان دینے کو تیار ہو جاتے انھیں اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ فعل بُرا ہے یا بھلا۔ اُن کا مقولہ تھا "یار کی یاری سے کام اس کے فعلوں سے کیا کام"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور یہ ان کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب سید کے خلوص، سچائی، راستبازی اور محبت کا اثر تھا۔

وہ اپنے دفتر کے ملازموں نیز بنچ کے نوکروں سے بڑی شفقت اور

مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے جو ایک بار اُن سے بندھ گیا پھر وہ گویا اس کی جاگیر تھی۔ مرتے دم تک ساتھ رہا۔ یوں بھی وہ کسی کی شکایت نہیں سنتے تھے لیکن اگر کسی نے اُن کے ملازم کی بد دیانتی، بد اطواری وغیرہ کی شکایت کی تو وہ سُنی ان سُنی کر دیتے تھے اور ان کے اعتماد میں ذرا فرق نہ آتا۔ وہ کسی ملازم کو شکایتیں سننے کے بعد بھی برطرف نہ کرتے؛ یہ بات ان میں پُرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب اُنھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹے خفا ہوتے تھے۔ اسی قسم کی مروّت سرسید میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے " خانۂ مروّت تباہ" چنانچہ ان کے دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال کے معاملے میں یہی ہوا۔ یہ شخص علی گڑھ کے ممتاز کایستھ خاندان کا تھا۔ اس کا باپ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بارہا ان تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں وہ جوڑی پر آتا ہے اور بڑی شان سے رہتا ہے۔ اس کی دیانت مشتبہ ہے میں نے بھی اُس شخص کو دیکھا تھا وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے، گھر سے خوش حال ہے، وہ صاف سُتھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اس سے جلتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ پنجاب میں وہ سرکاری ملازم تھا اور روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا پا چکا ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ شریف ایک بار ٹھوکر کھا کر پھر سنبھل جاتا ہے اور خطا نہیں کرتا۔ اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جعلی دستخط بنا بنا کر چیک جاری کرتا رہا اور ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ خورد برد کر لیا۔ اس

غبن کا حال اس کے دفعتہً بیمار ہونے پر کھلا۔ اُس سے سید صاحب کو جو صدمہ پہنچا وہ بیان سے باہر ہے۔ عدالت کی حاضری کی جو چوٹ لگی تو اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ شام بہاری لال پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اسی بیماری کی حالت میں گرفتار ہوا اور حوالات میں رکھا گیا۔ اثنائے مقدمہ ہی میں جب کہ وہ حوالات میں تھا کچھ کھا کر مر گیا۔ اس حادثے سے سرسیّد کو تو سخت اذیت اور رنج و ملال پہنچا ہی تھا، کالج کے کاموں پر بھی کچھ دن کے لیے بُرا اثر پڑا۔

نچ کے ملازموں سے بھی ان کی مروت کا یہی حال تھا۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جائے۔ نوکروں نوکروں کی مار پیٹ یا بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ چناں چہ جب ایک طالب علم (بورڈ) نے کالج کے ایک ملازم کو کسی بات پر مارا تو سیّد صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ اُسے خارج کر دیا جائے۔ اس پر طالب علموں نے بڑا ہنگامہ مچایا اور ان کی ایک بڑی جماعت کالج چھوڑ کر شہر چلی گئی۔ شہر کے ذی اثر اور ہمدرد رئیسوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، لیکن سرسیّد کا اصرار تھا کہ جب تک طالب علم ملازم سے معافی نہ مانگے گا اُسے کالج میں داخل نہ کیا جائے گا۔ یہ سبق انھیں والدہ نے دیا تھا۔ لڑکپن میں انھوں نے گھر کے پُرانے ملازم کو کسی بات پر تھپّڑ مارا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئیں اور کہا اِسے گھر سے نکال دو، یہ اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چناں چہ ایک ماما ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ تین دن تک خالہ کے مکان میں چھپے رہے۔ تیسرے دن خالہ والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور

معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا جب تک وہ نوکر سے قصور معاف نہ کرائے گا۔ میں معاف نہیں کروں گی۔ چنانچہ جب نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تو قصور معاف ہوا۔ یہی ایک نہیں انھوں نے اخلاق کے بہت سے سبق اپنی والدہ سے سیکھے اور عمر بھر ان پر عمل کیا۔

وہ بڑے خود دار تھے۔ اور کسی ایسی بات کو جو خود داری کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ابتدا میں جب وہ مدرستہ العلوم قائم کرنے کا ڈول ڈال رہے تھے، انڈین آبزرور میں اس کے خلاف ایک آرٹیکل چھپا جس میں یہ لکھا تھا کہ مسلمان سخت متکبر اور متعصب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں سر سید نے بڑا سخت آرٹیکل لکھا اور لکھا "کہ ہاں ہم متکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقہ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آئے اور ہم تعلیم بھی پائیں۔"

وہ اپنے طالب علموں سے بھی ایسی ہی خود داری کی توقع رکھتے تھے۔ ایک سال (غالباً ۱۸۹۲ء میں) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں تھا اجلاس ختم ہو گیا تھا، سب چلے گئے تھے اور ہال خالی تھا۔ صرف سید صاحب رہ گئے تھے جو میز پر سے اپنے کاغذ سمیٹ رہے تھے۔ اس اثناء میں طالب علم چپکے چپکے آئے اور کرسیوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے جو یہ دیکھا تو پوچھا کیا ہے، کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا کہ کانفرنس میں بمبئی کے ایک سیٹھ صاحب آئے ہیں وہ طالب علموں کو مٹھائی تقسیم کریں گے۔ یہ سننا تھا کہ برس پڑے اور کہا تم بڑے بے غیرت ہو کر مٹھائی کے لالچ میں یہاں بھکاریوں کی طرح آ بیٹھے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔

کیا کالج سے تم نے یہی بے غیرتی سیکھی ہے .... اب لڑکے کھسکنے شروع ہوئے اور چند منٹ میں ہال خالی ہو گیا اور سید صاحب اپنے کاغذ سمیٹ کر رخصت ہو گئے۔ اُن کی بڑی تمنا تھی کہ مدرسۃ العلوم کے طلبہ ہمت، جرأت اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں۔ اور جب کبھی کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔

ایسی ہی خودداری کا ایک دوسرا واقعہ لکھتا ہوں۔ ان کے ایک عزیز دوست (غالباً مولوی مشتاق حسین) نے جب کہ وہ یو۔ پی میں کسی سررشتے میں ملازم تھے۔ یہ اطلاع دی کہ ان کا افسر نماز پڑھنے پر معترض ہوتا ہے۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"بھائی .... کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت پر وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا، نہایت لچرپنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اُس کو اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی

اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر بجلیانا اور گڑگڑانا، اور حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا تزاق سانی استعفا دے دینا تھا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسّر ہوتی، فاقے مرجاتے نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام۔"

سیرت فریدیہ میں سرسید نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پڑھنے سے ظاہر ہے کہ گھر کے سارے انتظام اور اولاد کی تربیت کا بار اُن کی والدہ پر تھا۔ یہ سرسید کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی والدہ بڑی دانشمند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور ان میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ سرسید کی زندگی پر ان کا بڑا اثر تھا۔ عام توہمات جو مسلمانوں میں مذہب کے نام سے مروج ہو گئے ہیں ان کے گھر میں ان باتوں کا مطلق چرچا نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ" اس زمانے میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں، اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔" غرض کہ مذہبی پابندی ابتدا سے اُن کی تعلیم و تربیت کا جز تھی۔ لیکن جب اُنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصاً مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تو انھیں مذہبی مسائل اور مذہبی تحقیق کی طرف خاص طور سے توجہ کرنی پڑی۔ کیونکہ اُن کی اس تحریک کے خلاف سارے ملک میں مخالفتوں کا جو زبردست طوفان اُٹھا اور اعتراضات کی جو بوچھار ہر طرف سے ہوئی وہ سب مذہب کی بنا پر تھی۔ علاوہ اس کے عیسائی مشنریوں اور یورپی مصنفوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت اور بانی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت پر

پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ ہندُستان کی انگریزی حکومت کے ارکان نے اسلام کو فساد و بغاوت کا بانی مبانی قرار دے رکھا تھا اور یہ بات اُن کے دل میں جاگزیں تھی کہ مسلمان از روئے مذہب حکومت انگریزی سے بدخواہی اور بغاوت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان سب آفتوں سے بڑھ کر ایک آفت یہ تھی کہ قوم کے نوجوان جو کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں مغربی تعلیم پا رہے تھے اُن کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہو رہے تھے اور وہ مذہب سے بیگانہ اور متنفر ہوتے جا رہے تھے۔ مولوی صاحبان اِن کی کتابیں اور مناظرے تشفی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ جدید سائنس نے پُرانے حربوں کو بیکار کر دیا تھا۔ سیّد صاحب نے بڑی دلیری اور جرأت اور کمال تحقیق اور محنت سے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے لیے اُنھیں ایک نیا علمِ کلام ایجاد کرنا پڑا۔ یہ اُن کا ایسا عظیم الشان کام ہے کہ اس کے تفصیلی بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ اوہامِ باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ جو مذہب کی آڑ لے کر اسلام اور اہلِ اسلام میں گھر کر چکے تھے، اُن کا قلع قمع کیا۔ جن باا ثر انگریزوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام غداری اور بغاوت سکھاتا ہے اور مسلمان کبھی حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے اور جن یورپین مصنفوں نے یہ لکھا تھا کہ اسلام ترقی کا مانع ہے اُن کی تحریروں کے دنداں شکن جواب دیے۔ جس زمانے میں حکومت نے وہابیوں پر ظلم توڑے اور اُن کے عقائد کو فساد اور بغاوت کا سرچشمہ قرار دیا تو بڑی دلیری سے اُن کی حمایت کی اور اُن کے خلاف جو کچھ کہا گیا اور لکھا گیا اس کی پُرزور تردید کی۔ یہاں تک کہ اس کا صاف اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں۔ سر ولیم کی کتاب کے جواب لکھنے کی تیاری کی جس میں اسلام پر رسول اللہ صلعم کی سیرت پر سخت اعتراض کیے تھے۔ ہندُستان میں کافی سامان میسّر نہ آیا تو لندن

کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں اور دوسرے ذرائع سے کتابیں مہیا کیں۔ اس کی تیاری اور طباعت میں مصارف اس قدر بڑھ گئے کہ اپنا کتب خانہ اور سامان وغیرہ فروخت کرنا پڑا، قرض لیا اور دوستوں سے روپیہ جمع کیا اور شب و روز محنت شاقہ اٹھا کر ایسا مدلل جواب لکھا کہ مخالف بھی مان گئے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے بے شمار مضامین لکھے۔ تقلید کے خلاف زبردست مضامین تحریر کیے۔ ابطال غلامی پر ایک رسالہ لکھا اور یہ ثابت کیا کہ لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث صحیح میں نہیں۔ سید احمد خاں "پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں غلامی نہیں اور اسے ثابت کرکے دکھا دیا۔ تحقیق اور اجتہاد میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اُسے توڑا۔ بہت سے مسائل کی اُلجھنوں کو سلجھایا۔ غرض اسلام کی وہ بے نظیر خدمت کی جو کسی دوسرے سے نہ بن آئی۔

سرسید بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے اور جیسا کہ انھوں نے بارہا کہا ہے کہ میں اس لیے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا بلکہ اسلام پر میرا یقین میری ذاتی تحقیق پر ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ انگلستان جا کر ترک اسلام نہ کر دیں لکھتے ہیں "جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی ڈاڑھی والوں کو ہزار ہزار دانے کی تسبیح والوں کو اور جو مکّہ مدینہ سے پیر و مرشد کا جبّہ و دستار لے کر آتے ہیں ان کو بھی نہیں"۔ ایک دوسرے دوست کو اسی بارے میں تحریر کیا، اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات اسلام پر متوجہ

نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا" اسلام پر جہاں کسی نے کوئی نکتہ چینی کی وہ فوراً اس کا جواب لکھتے چنانچہ اس زمانے میں جبکہ ان کی حالت بہت نازک تھی ایک عیسائی نے امہات المومنین پر ایک رسالہ لکھا جس میں آنحضرت صلعم کے ازواج اور آپ کے اخلاق پر بہت سخت اعتراض کیے گئے تھے۔ باوجودیکہ کثرت آلام کی وجہ سے ان پر بقول مولانا حالی "ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے" مگر اسی حالت میں اس رسالے کا جواب لکھنا شروع کیا۔ ابھی یہ تحریر پوری نہ ہونے پائی تھی کہ رحلت فرما گئے۔

اگرچہ وہ پکے مذہبی اور اسلام کے شیدائی تھے مگر تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ان کے احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور اُن سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ لکھی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں اُنھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی اُن کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا اور وہ ہمیشہ باہمی اتحاد اور آشتی کی تلقین کرتے رہے۔ یہ محض زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر اُن کا عمل بھی تھا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں اسلام اور بانیِ اسلام صلعم کے خلاف ناقابل برداشت دریدہ دہنی سے کام لیا ہے جس نے ہندو مسلمانوں میں سخت منافرت پھیلا دی تھی لیکن جب سوامی جی کا انتقال ہوا تو سرسید نے اُن کی وفات پر بڑا آرٹیکل لکھا اور اُن کے اصلاحی کاموں کی بیحد تعریف کی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ ہر ایک سچے اور پکے مسلمان کی بے تعصبی اور رواداری۔ یہ ایک نہیں ایسی اُن کی بیسیوں تحریریں ہیں۔

افسوس کہ اُن کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب والم میں گزرے۔ پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور دوسرا اُس سے بڑھ کر سید محمود کا کثرت شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ مختل کر دیا تھا اور وہ عالم دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھیں۔ سرسید کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تئیس سال سے مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے اور ایک غیر گھر میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ اس رنج نے جو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا سید صاحب کو بٹھا دیا، دل بجھ گیا، خوش دلی جاتی رہی۔ لیکن وہ لگن جو دل کو لگی ہوئی تھی اس کی آگ اس وقت بھی باقی تھی۔ موت سے چند روز پہلے تک، جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے۔ قومی معاملات پر برابر لکھتے رہے۔ آخر وہ دن آ پہنچا جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور وہ قوم کا فدائی ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ ہم میں نہیں رہا لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گیا ہے کہ جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُس کی رائے اور اجتہاد میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی لیکن اس کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم و فضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں۔ لیکن ان کا دائرۂ عمل ایک یا دو مہمات تک محدود تھا۔ لیکن سرسید کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات، بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایسا قوی جذبۂ قومی پیدا کیا

جو اب تک کام کر رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر اُس کی زندگی کا بہ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔ اُس کا دل قوم کی درد مندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دُھن میں لگا رہا اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا۔ اُس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ جب مرا تو کفن کے لیے ایک پیسہ نہ نکلا۔ غیروں نے اپنے خرچ سے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ یہ ہے مقبول بندوں کی شان۔

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بندِ قوم
گر توانی، می توانی سیّد احمد خاں شدن

ڈاکٹر محمد اقبال

ڈاکٹر محمد اقبال مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ شاید میں انھیں کبھی نہ بھولوں گا میں اپنی زندگی میں سینکڑوں اشخاص سے ملا ہوں اور ملتا رہتا ہوں۔ ان میں عالم وفاضل بھی ہیں، ادیب وشاعر بھی ہیں، صاحبِ ثروت بھی ہیں اور مفکر و مجتہد بھی۔ لیکن ایسے دو چار ہی ملے، جن میں انسانیت بھی ہو اور یہ وہ شے ہے جو بہت کمیاب ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے میرے دل میں ڈاکٹر محمد اقبال کی بیحد قدر ہے۔

وہ علم دوست اور علم کے شیدائی تھے اور حقیقی معنوں میں پروفیسر۔ تحقیق کا چسکا شروع ہی سے تھا۔ میرے ایک دوست ایک قدیم عربی تاریخ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک لفظ اُس میں ایسا آگیا تھا جو اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ بہت سی لغات کی ورق گردانی کی کچھ پتہ نہ چلا۔ عربی کے کئی قدیم و جدید عالموں سے رجوع کی، کہیں سے شافی جواب نہ ملا۔ ایک بار وہ میرے ساتھ لاہور آئے۔ ایک ملاقات میں محض اتفاق سے اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے بھی اس لفظ کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادنیٰ تامّل کے بعد اُس کی حقیقت بتادی۔ پھر وہ اپنے کتاب خانے میں گئے، اور ایک کتاب تلاش کر کے لائے جس سے اُن کے خیال کی تائید ہوتی تھی۔ میرے دوست کو بہت حیرت ہوئی اور وہ ڈاکٹر صاحب تبحر کے قائل ہو گئے۔

فارسی زبان پر بھی اُنھیں بہت عبور تھا۔ ایک علمی تقریب کے سلسلے میں

ایران بھی ہو آئے تھے۔ فارسی بلا تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ کیمبرج میں دو سال پروفیسر براؤن کے ساتھ کام کیا اور اسی زمانے میں سلجوق نامہ، ابن بی بی ایڈیٹ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا ذاتی کتب خانہ ایسا ہی تھا جیسا ایک پروفیسر اور محقق کا ہونا چاہیئے۔ اس میں اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن کی منتخب اور اُن کے اپنے ذوق کی کتابیں تھیں۔ بعض نسخے بہت بیش قیمت اور نادر تھے۔

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا، اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا بلکہ یہ کھانے پینے، لباس، بات چیت، ملاقات، دوستوں کے انتخاب، غرض زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نظر آتا تھا۔ موسیقی میں بھی دخل تھا اور اس کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

اُن کا ادبی ذوق بھی بہت شستہ تھا۔ وہ بہت صاف اور شگفتہ اُردو لکھتے تھے۔ اُردو کے عاشق تھے۔ اور اسے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زبان خیال کرتے تھے۔ تقسیم مُلک کے بعد اُنھیں بڑی تشویش ہو گئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُردو ہاتھ سے نکل جائے۔ کہتے تھے اگر اُردو نہ رہی تو ہماری قومیت بھی رخصت ہو جائے گی اور پاکستان نہیں رہے گا۔ ہماری قوت اور ہمارا اتحاد اُردو ہی کی بدولت ہے۔ بعض وقت اس خیال سے سخت پریشان اور افسردہ خاطر ہو جاتے تھے۔ اُن کے گھر میں زیادہ تر اُردو ہی بولی جاتی تھی۔

ادارۂ معارف اسلامیہ کے سکریٹری تھے اور اس کام سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ یہ ادارہ کیوں وجود میں آیا، اس کی بھی ایک تاریخ ہے۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں ابتدا میں عربی، فارسی، اور اُردو کا ایک مستقل شعبہ تھا۔ بعد میں کونسل نے جس میں مسلمان ممبر گنتی کے تین چار ہوتے تھے، اُردو کو انڈین

سیکشن میں اور فارسی کو ایرانی شعبہ میں ضم کر دیا۔ عربی، اسلامیات اُن سے جُدا ہو گئے۔ یہ امر کانفرنس کے مسلمان ارکان کی ناخوشی کا باعث ہوا، اور انھوں نے اپنا ایک الگ ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ علامہ محمد اقبال نے اس کی ہمت افزائی کی اور آخر اس کا قیام عمل میں آگیا۔ اعلاحضرت حضور نظام نے دس ہزار یک مشت اور تین ہزار سالانہ کی رقم منظور فرمائی اس کے اجلاس ہر دو سال کے بعد ہوا کرتے تھے۔ چناں چہ یہ اجلاس ۱۹۳۳ء ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء میں ہوئے اور اس میں بڑے اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ ۱۹۳۸ء کے بعد سے اس کا کام سُست پڑ گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ کے ادارۂ معارف کے جلسے اب کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے اُسے اب کوئی دعوت نہیں دیتا۔ ایک آدھ جگہ سے دعوت آئی مگر وہ ملتوی ہو گئی۔ اتنا سرمایہ اس کے پاس ہے نہیں کہ وہ خود انتظام کر سکے۔ میں نے کہا آپ دلّی میں جلسہ کیجیے میں سب انتظام کر دوں گا۔ ہمیں اس کے لیے کسی کی محتاجی نہ ہوگی۔ انجمن کا مکان بہت بڑا ہے اور اس کا صحن بہت وسیع ہے وہیں اس کا جلسہ ہو جائے گا۔ مصارف کے لیے رقم بھی فراہم ہو جائیگی۔ بہت خوش ہوئے اور اسی وقت سے دلّی میں ۱۹۴۷ء کے اجلاس کی سوچنے لگے، لیکن ۱۹۴۶ء ایسا بھاگوان نکلا کہ کسی کے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور دلّی ہم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ کراچی میں ہمارے قدم ذرا جم جائیں تو معارف اسلامیہ کو مدعو کروں، لیکن افسوس صد افسوس ڈاکٹر صاحب دفعتہً قلب کی حرکت بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ اُن کی بے وقت وفات سے پنجاب یونی ورسٹی نیز علمی طبقے کو بڑا صدمہ پہنچا۔

بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت اور ہمدردی اُن کی گھُٹی میں تھی۔

اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں عالمانہ متانت پائی جاتی تھی۔ لیکن اپنے بے تکلّف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے اُن کی زندہ دلی کا ثبوت ملتا تھا۔ اُن کے خاص دوستوں کا حلقہ محدود تھا، مگر دوستی کے بڑے پکّے تھے اور جس سے جو تعلق تھا اُسے آخر تک نبھایا۔ اپنے شاگردوں اور رفیق پروفیسروں سے اُن کے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے اور وہ بھی اُن سے عزّت و محبّت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خفا بھی ہو جاتے تھے۔ مگر اس خفگی میں کوئی تلخی یا دل آزاری نہیں ہوتی تھی اور کچھ دیر بعد اُس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا تھا۔

اورنیٹل کالج میگزین کی ترتیب وغیرہ میں بھی ان کا بڑا حصّہ تھا۔ خود بھی لکھتے اور دوسروں سے بھی لکھواتے۔ اُن کے زمانے میں یہ میگزین بڑے عروج پر تھا اور اُس کا علمی پایہ بہت بلند ہو گیا تھا۔

وہ بڑے مہمان نواز تھے اور اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ میں دن میں کھانا نہیں کھاتا وہ یہ جانتے تھے، مگر جب تک میں اُن کا مہمان رہا وہ ہر روز دوپہر کے کھانے کے وقت میرے سر ہو جاتے اور بہت اصرار کرتے۔ مجھے اُن سے پیچھا چھڑانے میں بڑی دشواری ہوتی۔ چائے کے بڑے شوقین تھے۔ تڑکے مُنہ اندھیرے وہ میرے کمرے میں آجاتے اور اپنے ہاتھ سے چائے بناتے۔ خود بھی پیتے اور مجھے بھی پلاتے۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ ٹہلنے کو جاتے۔ رستے میں ہر قسم کی باتیں ہوتیں۔ اُس وقت اُن کا مزاج شگفتہ ہوتا تھا اور بڑے مزے مزے کی باتیں کرتے تھے۔

وہ بہت بے نفس شخص تھے۔ جلب زر کا عارضہ جو آج کل نئی تانتی میں عام طور پر پایا جاتا ہے اُن میں بالکل نہ تھا۔ میں نے اُن سے "ایران بہ عہد ساسانیان"

کے ترجمے کی درخواست کی۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور شوق سے ترجمہ کر کے مجھے بھیج دیا۔ میں نے معاوضے کے طور پر انجمن کی طرف سے پندرہ سو روپیہ کا چک اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس کے جواب میں اُنھوں نے لکھا کہ میں نے یہ ترجمہ کسی معاوضے کے خیال سے نہیں کیا تھا۔ میں اُسے اپنے ذاتی صرف میں نہیں لانا چاہتا۔ میں اس رقم کو پنجاب یونیورسٹی کو اُردو تقریری مقابلے کے لیے دیدوں گا اور یہ تقریری مقابلہ آپ کے نام سے موسوم ہوگا۔ میں نے لکھا کہ مجھے منظور نہیں اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اُنہوں نے جواب دیا "اگر آپ اسے منظور نہ کریں گے تو چک واپس کردوں گا۔ ہر چند میں نے اُن سے معذرت کی اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے اور اس میں اُنھوں نے خلاف معمول اس قدر اصرار کیا کہ آخر مجھ کو ہی جھکنا پڑا۔[1]

ڈاکٹر صاحب کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کی اولاد بھی بڑی سعادت مند، نیک کردار اور علم کی شایق نکلی۔ یہ اُن کی تربیت، ذاتی مثال، اور نیک نیتی کا پھل تھا۔

ایسے بلند نظر، شریف النفس، بے تعصب، نیک خیال شخص بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے ایسے بہت سے اشخاص کی ضرورت ہے۔ خدا کرے پاکستان کی قومی تعمیر میں ایسے مبارک ہاتھوں سے کام لیا جائے۔

---

[1] یہ تقریری مقابلہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام اب بھی ہر سال ہوتا ہے اور مولانا عبدالحق صاحب کے اسم گرامی سے موسوم ہے۔

مولانا حسرت موہانی

سنہ ۱۹۵۱ء

اگر کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے۔ ان کی ٹوپی پر جو اکثر ترکی ہوتی تھی آدھ آدھ انگل چیکٹ جما ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اُجلا، جوتے نے کبھی بُرش کی صورت نہ دیکھی تھی، آواز جھینگر سے ملتی جلتی۔ لیکن اس بے ڈول قالب میں بے پایاں رُوحانی قوت، اخلاقی جرأت اور خلوص و صداقت تھی۔ آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہوگا، اس کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی مصیبتیں، ایذائیں اور عقوبتیں جھیلیں، لیکن اُن کے قدم میں کبھی لغزش نہ آئی۔ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت بے باک، جس طرح انھوں نے کانگرس میں کامل آزادی کی آواز اُٹھائی اسی طرح مُسلم لیگ میں بھی یہ نعرۂ حق بلند کیا۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ دوسروں پر چھا جاتے تھے۔ بھارت کی دستورساز مجلس اور پارلیمنٹ میں بھی اُن کی آزادی اور جرأت کا یہی رنگ تھا۔ بعض وقت اُن کی للکار سے سردار پٹیل اور اُن کے ساتھی گھبرا اُٹھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے خیالات میں اُلجھ جاتے اور متضاد باتیں کہہ جاتے لیکن جلد راستے پر آجاتے تھے۔ تصنّع اور تکلّف اُن کو چھو نہیں گیا تھا۔

اُن کی زندگی انتہا درجے کی سادہ تھی۔ بالکل درویش صفت تھے بعض اوقات وہ ہاتھ میں تھیلا لٹکائے اور بغل میں پوٹلی دبائے پیدل اسٹیشن کو جاتے نظر آتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے امیر غریب سب سے بے تکلف ملتے اور بے تکلف باتیں کرتے۔ اُن کے ہاں کوئی راز نہ تھا۔ سب کچھ کہتے چلے جاتے تھے۔ نہایت منکسر مزاج، حلیم الطبع اور ہمدرد تھے۔ کوئی اُن کے پاس اپنی مصیبت یا بے انصافی کا دُکھڑا لے کر جاتا تو اُس کے لئے دَوڑے دوڑے پھرتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔ رائے کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ اِن معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدّت کے ساتھ۔ لیکن اُن کا دل صاف رہتا تھا۔ وہ اُن لوگوں سے بھی جو سیاسی امور میں اُن سے اختلاف رکھتے تھے لطف اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ ان میں بعض اُن کے دوست بھی تھے، باوجود اس کے دوستی کا احترام کرتے۔

سالہا سال تک اُردوئے معلّیٰ اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضامین نکلتے رہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک یہ بات بڑی اچھی تھی کہ بعض ایسے اچھے شعرا کے کلام کا انتخاب بھی چھپتا رہتا تھا جن کا کلام کبھی طبع نہیں ہوا تھا یا کبھی طبع ہوا تھا تو اب نایاب تھا۔ ہمارے ادیبوں میں بعض ایسے بھی تھے جیسے مولانا ابوالکلام آزاد یا مولانا ظفر علی خاں جو ادب سے ہٹ کر سیاست کے میدان میں کُود پڑے۔ ان کے اس عمل سے سیاست کو تو کچھ فائدہ پہنچا نہیں البتہ ادب کو نقصان پہنچ گیا۔ مولانا حسرت ایسے ادیب تھے جنھوں نے باوجود اوّل سے آخر

تک سیاست میں شور بور ہونے کے ادب کے دامن کو نہ چھوڑا، اور جس طرح انھوں نے سیاست میں ہنگامہ برپا کرکے آزادی، حق گوئی اور جرأت کی بے نظیر مثال پیش کی، اسی طرح اُنھوں نے اپنے افکار و خیالات سے شعر کا درجہ بلند کر دیا۔ وہ سوائے شعر کے ہر چیز میں خواہ وہ زندگی کی سادگی ہو یا سیاست، انتہا پسند تھے۔ شعر میں انھوں نے اعتدال، متانت اور حُسن ذوق کو قائم رکھا۔ اُردو شاعری پر اُن کا بڑا احسان ہے اور اس سے ہماری شاعری میں اُن کا خاص مقام ہے۔ اُن کی وفات ہر اعتبار سے صدمۂ عظیم ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ اُن کے کتب خانے میں اُردو کا بہت اچھا اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔ بہت سے مخطوطات، پُرانے تذکرے، قدیم اساتذہ کا کلام، پُرانے اخبار اور رسالے اور بہت سے ایسی مطبوعات ہیں جو اب نایاب ہیں، اور جو انھوں نے بڑی احتیاط اور محنت سے جمع کی تھیں۔ میں نے بارہا اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ اس ذخیرے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیجیے کہ تلف ہونے سے بچ جائے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اگر آپ ان ذخیروں کو انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرما دیں تو ہم انجمن کے کتب خانے میں ایک خاص حصہ آپ کی یادگار میں وقف کر دیں گے۔ انجمن اس کی قیمت دینے کو تیار ہے۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے رہے لیکن کبھی ایفائے وعدہ کی نوبت نہ آئی۔ گذشتہ سال میں نے ایک صاحب کو کانپور میں اس کام کے لیے خاص طور پر متعین کیا، کامیابی نہ ہوئی۔ پچھلی مرتبہ جب وہ کراچی میں تشریف لائے تو پھر میں نے اُن سے یہی عرض کیا۔ کہنے لگے کہ پچھلی برسات میں کچھ کتابیں خراب ہو گئی تھیں دُرست کرا رہا ہوں، اس کے بعد بھیج دوں گا۔

اب ان کے انتقال کے بعد نہ معلوم اُس کا کیا حشر ہوگا۔ ہماری بے شمار عزیز چیزیں خاص کر کتب خانے تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اُن کو تلف ہونے سے بچانا ہمارا بہت بڑا فرض ہے۔ یہ سرمایہ دار ادارے یا حکومتیں ہی کر سکتی ہیں۔ لیکن انھیں کیوں کر سمجھایا جائے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں یہ بھی کر چکا ہوں۔ لیکن قصر حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ اُن میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔ مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

(از روزنامہ امروز کراچی)

آہ عبدالرحمن صدیقی

۱۹۵۳ء

افسوس صد افسوس آج ہم میں سے ایک ایسا شخص اُٹھ گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے اور شاید مدت تک نہ ملے۔ وہ راست گوئی، اخلاقی جرأت، بے باکی و آزادی میں نیک نام نہیں بدنام تھا۔ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہ ہوا اور جس بات کو وہ سچ سمجھتا تھا اُسے وہ بڑے سے بڑے شخص کے منہ پر یا بھری مجلس میں کہنے میں باک نہیں کرتا تھا۔ وہ اگر ذرا بھی زمانہ سازی اور مصلحت کوشی سے کام لیتا تو بڑے رُتبے پر پہنچ جاتا۔ مگر ہماری نظر میں وہ اُن نام کے بڑے لوگوں سے کہیں بڑا تھا جو زمانہ سازی، چاپلوسی، منافقت اور سازش سے بڑے بڑے مناصب پر پہنچے ہیں۔ اُس نے طالب علمی میں، مرکزی کونسل کی ممبری میں، کلکتہ کی میئری میں، مسلم لیگ میں، خلافت میں، کلکتہ کی مجلس وضع قوانین میں ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اُس نے اصول کی خاطر لڑائیاں کیں، نقصان اُٹھایا، دوستوں کی ناراضی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول کو نہ چھوڑا۔

وہ نہایت قابل شخص تھا۔ علم کا شائق اور علم دوست تھا۔ اس کی معلومات بہت وسیع تھیں خاص کر اسلامی ممالک کے متعلق اس کی معلومات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ مصر و شام اور ترکی کے نامور لوگ اور مختلف جماعتوں کے پیشواؤں سے اُس کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بڑا پُراثر اور پُرجوش مقرر تھا۔ اُس کی تحریر شگفتہ اور پُرزور ہوتی تھی۔ مورننگ نیوز کی اڈیٹری اِس شان

سے کی کہ اب تک اس کی یاد تازہ ہے۔

انجمن ترقیِ اُردو سے اُسے خاص لگاؤ تھا اُس نے بلامبالغہ سخنے، قدمے درمے، مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتا تھا۔ انجمن پر جب کبھی کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اُس کے لئے سینہ سپر ہوگیا۔ وہ انجمن کی مجلس نظما، کا رُکن اور اُس کے کالج کا سکریٹری تھا۔ میں نے جب کبھی انجمن کے کسی کام کے لیے چندہ کی تحریک کی تو اس کا چندہ سب سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔ مجھے کبھی اُس سے کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ بے کہے اور بے طلب دیتا تھا۔ اُس نے قوم کی، انجمن کی اور دوستوں کی بے لوث خدمت کی۔ ایسے سچے، مخلص اور ہمدرد دوست کم ہوتے ہیں۔ وہ صادق القول اور واثق المحبت تھا۔ وہ مصیبت کے وقت کام آتا اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے پہنچتا۔ اور جہاں تک امکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتا۔ اس کی دوستی پرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکا تھا اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھا۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے یا قوم سے غدّاری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں اُسے سخت عداوت ہو جاتی۔ وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا تھا جو بدتمیز یا گندے ہوتے۔ چونکہ وہ خود صاف گو تھا اس لیے غیبت کو پسند نہیں کرتا تھا خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہ کرتا۔ وہ لڑتا جھگڑتا اور خفا بھی ہو جاتا تھا لیکن یہ عارضی صورت ہوتی کچھ دنوں بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص اور محبت سے ملتا جیسے پہلے ملا کرتا تھا۔

وہ غریبوں کا بہت ہم درد تھا اور اُن کے کام آتا۔ اپنے ملازموں سے بہت اچھا سلوک کرتا اور اپنے سے زیادہ اُن کی آسائش کا خیال کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ملازم اُس کے فدائی تھے۔ اس جان لیوا بیماری میں اُس کے ملازم صدیق نے جیسی خدمت کی نہ جورو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا اور نہ کوئی دوست۔ وہ اُس کی خفگی، درشتی، گالیوں اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتا اور اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اب اُسے ایسا آقا کہاں ملے گا۔

مجھ سے ایک ایسا دوست چھٹ گیا کہ اب ویسا ملنا ممکن نہیں۔ قوم ایک ایسے سچے، بے لوث آزاد خیال خادم سے محروم ہو گئی کہ ویسے اب اس کے حلقے میں مفقود ہیں:۔

دوست اور پھر دوست بھی سچّا عجب نعمت ہے یاں
ہو نہیں سکتا بدل اک دوست کا سارا جہاں

اُس کے دوستوں کو اُس کی زندہ دلی، خوش طبعی، اُس کے لطیفے اور اُس کے سفر کے عجیب و غریب واقعات اور خاص کر اُس کی پُرلطف "جدّت بھری" گالیاں بار بار اور ہمیشہ یاد آئیں گی۔ وہ جس محفل میں ہوتا وہاں بہار آجاتی اور یہ معلوم ہوتا کہ گلستاں میں بلبل چہک رہا ہے۔ افسوس اُس کے بعد احباب کی صحبتیں سونی نظر آئیں گی۔

اُس پر خدا کی رحمت ہو کہ اُس نے بہتوں کا ساتھ دیا، بہتوں کے بگڑے کام بنائے، اور بہتوں کی دوستی کا حق ادا کیا۔

(از قومی زبان)

درویش پروفیسر - ری ہٹ سک

پروفیسر ایڈورڈ ری ہٹ سک جرمنی کے باشندے تھے۔ لندن میں رہ کر انگریزی زبان سیکھی اور ہندوستان میں آکر عربی فارسی اور اُردو زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ اُن کے عربی فارسی کے اُستاد مولوی عبدالسّلام صاحب مسیحی متوطن پیل بندر کاٹھیا واڑ تھے۔ مولوی صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے پروفیسر صاحب سے ہر سنیچر کو شام کے پانچ بجے ملنے آتے تھے۔ کچھ یہ مولوی صاحب کے لیے بحث طلب علمی مسائل جمع کر رکھتے اور کچھ وہ جمع کر لاتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک بہت اچھی صحبت رہتی۔ وہ مدّت تک بمبئی ولسن کالج میں ریاضی کے پروفیسر رہے۔ مگر چند وجوہ سے کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور نیٹو اوپی نین (NATIVE OPINION) نام اخبار کے اڈیٹر ہو گئے۔ اور اس کام کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ آخر زندگی تک انجام دیتے رہے۔

انہی دِنوں میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ نے یہ اشتہار دیا کہ مبحث ذیل پر سب سے عمدہ مضمون کے لیے پانسو روپے انعام دیے جائیں گے۔

"مقابلہ کرو یونانی علوم کے اثر کا جو عربوں پر خلفائے عباسیۂ بغداد اور خلفائے بنو امیۂ قرطبہ کے عہد میں ہوا اُس اثر سے جو عربی علوم کا زمانۂ تاریک کے بعد یورپین دل و دماغ پر ہوا۔ اور اس مقابلے سے یہ نتیجہ نکالو کہ اغلباً یورپ کی موجودہ اعلا اور پختہ دماغی ترقی کا اثر مسلمانوں پر کیا ہوگا، جب کہ پھر ایک بار ہندستان میں اُن کو اس سے سابقہ پڑا ہے۔"

پروفیسر ری ہٹ سک نے اس موضوع پر ایک محققانہ اور اعلا درجہ کا مضمون لکھا جس کی محمڈن لٹریری سوسائٹی میں بہت تعریف ہوئی۔ خصوصاً سر چارلس ٹری ولین اور سر ولیم میور نے اُس کا ذکر بہت پُرتحسین اور عمدہ الفاظ میں کیا۔ پروفیسر ری ہٹ سک عربی فارسی اور اکثر السنۂ مغربی کے بڑے عالم تھے اور اُن کی تمام عمر علوم کے مطالعہ میں گذری۔ یہ انعام آخر ان ہی کو ملا۔

بمبئی کے چند نامی دولت مند مسلمانوں کی درخواست پر روضۃ الصفا خاوند شاہی اور تاریخ ابن اثیر کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مگر اِن صاحبوں نے حسب وعدہ حق السعی نہ دیا۔ جس سے ان کو بہت رنج ہوا۔ انتقال سے دو سال پہلے یہ دونوں ترجمے لندن کے ایک کتب فروش کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ تاریخ خاوند شاہی کا چھپنا شروع ہوگیا تھا۔ پروف کے تھوڑے ہی صفحے دیکھنے پائے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ یہ ترجمہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی انگلینڈ نے چھاپ کر شائع کیا ہے۔ علاوہ اس کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔ اور جون پور کے مہدیِ موعود (جن کے معتقدین

ایک گروہ حیدر آباد دکن میں ہی) کا تذکرہ بھی لکھا اور شہنشاہ جرمنی کے نذر کیا۔ شہنشاہ نے تشکریہ کے ساتھ قبول فرماکر شاہی کتب خانے میں رکھوادیا۔ مہدویوں کے عقائد پر بہت دل چسپ بحث کی ہی اور چند صوفی فرقوں اور یونان کے بعض فیلسوفوں کے اصول سے مقابلہ کیا ہی اور اخیر میں ان کو وجودیہ قرار دیا ہی۔

انھوں نے اور بھی تین چار کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ مصر کے مُردہ حروف کو زندہ کیا ہی اور عربی حروف سے تطبیق دی ہی۔

انھوں نے ایسی گلستاں کا ایک نسخہ بہم پہنچایا تھا جو اُن تمام نسخوں سے جداگانہ تھا جو گلستاں کے جواب میں لکھے گئے ہیں اور جن کا ذکر مولانا حالی نے حیاتِ سعدی میں کیا ہی۔ فرانس کا ایک کتب فروش اس کا ترجمہ کرانا چاہتا تھا۔ وہ نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ہی۔ ہمارے پروفیسر کا نسخہ منشی عبدالکریم صاحب کتب فروش بمبئی کے پاس ہی۔ انھوں نے منشی صاحب کے والد کو ملاحظہ کے لیے دیا تھا۔ لندن کے کسی نقاش نے اصل کتاب کی نقل کرکے بھیجی تھی۔ چوں کہ نہایت بدخط ہی اور اکثر الفاظ خلاف مروّجہ رسم الخط لکھے ہیں اور ہر صفحے میں کم و بیش ایسے بیس[؟] لفظ ہوں گے، اس لیے پڑھنے میں سخت دشواری واقع ہوئی، مگر انھوں نے بڑی عرق ریزی سے

(نوٹ صفحہ ۳۰۵)

سلہ ان کا نام سیّد محمد بن سید عبدالقادر تھا، فرقۂ مہدویہ والے ان کو میراں سید محمد مہدی کہتے ہیں۔ ولادت بہ مقام جون پور ۸۴۷ھ میں ہوئی۔ سنہ ۹۰۱ھ میں بہ مقام احمد آباد گجرات مہدویت کا دعوا کیا اور ۹۱۰ھ میں بہ مقام فراہ وفات پائی۔

ان الفاظ کو پڑھا اور ان کی صحت کی اور صحیح الفاظ کو حاشیہ پر لکھ دیا۔

لندن کے ایک جج کی درخواست پر فقۂ اکبر کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ مگر مولوی عبدالسلام کی وفات کے بعد وہ اُسے ختم نہ کر سکے۔

ان کی زندگی بالکل راہبوں اور درویشوں کی سی تھی۔ شادی آخر عمر تک نہ کی۔ بنگلے میں اکیلے رہتے تھے۔ اور شاید دو تین مہینے میں کبھی ایک بار جھاڑنے بہارنے اور صاف کرنے کی نوبت آتی تھی۔ بنگلے کے پھاٹک مقفل کرکے اندر بیٹھے رہتے تھے کہ لوگ مجھے غریب سمجھ کر بلا اجازت اندر گھس آتے ہیں اور میرا وقت ضائع کرتے ہیں۔ کسی کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے مگر وقت پر آ گئے تو کھا لینے میں مضائقہ بھی نہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے دعوتوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بے مصرف باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی۔ مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوصِ دل سے تھی۔ پُرانی ٹوپیاں دیوار میں لٹکا رکھی تھیں۔ اُن میں اپنے مسودے رکھ دیا کرتے تھے۔ بھوسے کی روٹی اور کافی پر گزارہ کرتے اور رُپیہ نہایت کفایت شعاری سے بچاتے تھے۔ مگر سب غریب بچوں کی ابتدائی تعلیم پر صرف کر دیتے۔ صبح کے نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ صرف رفع تکان کے لیے ناریل کی گڑگڑی پیتے تھے۔ جس میں سوکھا تمباکو استعمال کرتے۔ پانچ بجے کے بعد ہوا خوری کو نکل جاتے۔ ہر دن کے لیے ایک راستہ مقرر کر رکھا تھا اور یہ راہیں ایسی مقرر کی تھیں کہ سب کی سب سمندر

پر جاکر ختم ہوتی تھیں۔ لب سمندر جاکر دیر تک ٹہلا کرتے۔ اس وقت کسی دوست کی رفاقت چنداں گوارا نہ کرتے۔ جس کسی کو اُن سے علمی مسائل دریافت کرنے ہوتے تھے وہ ہَوا خوری کے وقت اُن کے ہم راہ ہولیتا۔ راہ میں کھڑے رہ کر بھی کام کی باتیں کرنے میں مضائقہ نہ کرتے۔ ایک غریب طالب علم کو لاطینی کا سبق ہَوا خوری کے وقت چلتے چلتے یاد کروا دیا کرتے تھے۔ خوب صورت آدمی تھے، قد لمبا تھا داڑھی ناف سے نیچے تک تھی۔ عربی فارسی بلا تکلف اس طرح بولتے تھے کہ عربوں اور مغلوں کو حیرت ہوتی تھی۔

وہ کہتے تھے کہ میرے والدین غریب تھے۔ میں نے اپنی ذاتی محنت سے علم حاصل کیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دُکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہوجاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ دماغ صاف ہوجاتا ہے۔ اواخر اکتوبر میں طبیعت میں کسل اور اضمحلال رہتا تھا۔ ہندستان کے لوگوں سے انھیں بڑی محبت تھی۔ اسّی برس کی عمر میں گردوں کے عارضے سے انتقال کیا۔ اور تخمیناً بیس ہزار روپیہ اور ایک بنگلا چھوڑا اور وصیّت کر مرے کہ اس رُپے سے غربا کے بچّوں کو مفت تعلیم دی جائے۔ انھیں بچوں سے بہت محبت تھی۔ ہر شام کو بچّے اُن کے بنگلے پر جمع ہوجاتے تھے اور وہ ان کو چنے تقسیم کیا کرتے تھے۔ وہ ہر وقت ہشّاش بشّاش رہتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک دوست جن کو پروفیسر صاحب کی ملاقات کا بہت اشتیاق تھا ہمارے ایک دوسرے مہربان

کے ساتھ جن سے پروفیسر صاحب کی اچھی راہ و رسم تھی، اُن سے ملنے گئے۔ بنگلہ پر جاکر دستک دی۔ ہمارے وہ دوست جو ملاقات کرنا چاہتے تھے اُس وقت سُرخ اطلس کا جبہ پہنے ہوئے تھے۔ دستک کی آواز سُن کر دریچے میں آکر دیکھا اور وہیں سے پکار کر کہا کہ میں سُرخ رنگ کے لباس والوں سے ملنا نہیں چاہتا۔

اس فاضل شخص کی زندگی عجیب وغریب تھی۔ اس نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح بسر کی مگر دوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالجوں کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سچے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

انھوں نے اپنا کتب خانہ لوگوں کے لیے وقف کر دیا جو اب دھوبی تالاب لائبریری میں محفوظ ہے۔

"افسر" ماہ جون ۱۹۱۰ء

ڈاکٹر بجنوری

سنہ ۱۹۱۸ء

مرحوم بجنوری پر کچھ لکھتے ہوئے دِل دُکھتا ہے، اور جب کبھی اس عزیز کا خیال آتا ہے تو دل پر عجیب کیفیت گزرتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی۔ یہ ہماری قوم کے اُن چند نوجوانوں میں تھے، جنھوں نے یورپ کی تعلیم سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا تھا۔ ورنہ اکثر یہ ہوا کہ ظاہری نمود و نمایش بے معنی اور مہمل رسمیں، مذموم آداب خوشی خوشی سیکھ کر آگئے اور اسی کو سرمایۂ علم سمجھ بیٹھے۔ مرحوم یورپ میں رہے مگر مشرقی اخلاق اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مغرب سے وہ باتیں سیکھیں جو یہاں میسر نہ تھیں۔ علم و ادب سے لگاؤ انھیں پہلے سے تھا، تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہوگئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔

تعلیم کے مسئلے سے انھیں خاص شغف تھا۔ ممالکِ یورپ کے

تعلیمی طریقوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ یہاں آکر انھوں نے ایک کالج قائم کرنے کا ڈول ڈالا تھا جس میں جدید طریقے پر صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے اس تجویز کی تفصیل سُن کر اس کی سرپرستی فرمائی اور معقول رقم جمع کر دی۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے بھی ایک رقم اس کے لیے عطا فرمائی۔ لیکن مرحوم کی بے وقت موت نے اس منصوبے کو اُن کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔ شعیب قریشی صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی صاحب اس منصوبے میں اُن کے ہم خیال اور ہم کار تھے اور اِن تینوں باہمت نوجوانوں نے اپنی زندگی اُس کے لیے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز جب زیرِ بحث تھی تو ان کے مشورے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

جامعہ عثمانیہ کے قائم کرنے کا ڈول بھی اسی وقت ڈالا جا رہا تھا، دارالترجمہ قائم ہو چکا تھا مختلف فنون اور علوم پر کتابیں ترجمہ اور تالیف ہو رہی تھیں۔ دو برس کی مسلسل محنت کے بعد اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ میٹریکولیشن اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں تمام مضامین اُردو کے ذریعے پڑھا سکیں۔ اب جامعہ کی ابتدا ہونے والی تھی، پرنسپل کی تلاش تھی۔ بہت غور و فکر اور گفتگو کے بعد قرعہ ڈاکٹر بجنوری کے نام پڑا۔ عین اُس وقت جب عرض داشت بغرض منظوری اعلیٰ حضرت حضور نظام کی پیش گاہ میں پیش ہونے والی تھی، اجل نے ہم سے اس جوہرِ قابل کو چھین لیا۔

مرحوم کبھی کبھی کسی خاص حالت یا منظر سے متاثر ہو کر شعر بھی کہتے تھے۔

ان کی نظم "شوجی کا رقص" بہت مقبول ہوئی۔ نظم کے ایک ایک لفظ سے نرت کی حرکت اور جنبش ہویدا ہے۔ اگر نظم پڑھتے ہوئے شوجی کی نرت کی تصویر بھی سامنے ہو تو عجیب سماں پیدا ہوجائے۔ لیکن شعر گوئی سے بڑھ کر ان میں شعر فہمی کا مادہ تھا۔ غالب پر ان کی تنقید اس کی شاہد ہے کہ انھوں نے میرزا کے اشعار کی تشریح میں کیسے کیسے نکات پیدا کیے اور سربستہ راز آشکارا کیے ہیں۔

جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار خاں کو نذر کیا تھا مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بیتاب ہوگئے اور اس اصلی نسخے کی طباعت کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلیٰ درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابک دست مصوروں سے تصویروں کی فرمایش۔ اُن کا یہ انہماک دیکھ کر اُن کے بعض دوست بھی اس شاہکار کی تکمیل میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے تھے، لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا۔

وہ دیوان بعد میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا جیسے اور کتابیں معمولی طور پر شائع ہوتی ہیں۔ جو بات ڈاکٹر بجنوری چاہتے تھے وہ کسی دوسرے کے بس کی نہ تھی۔

ڈاکٹر عبدالرحمان کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع نظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا، لیکن جب اُن کے اخلاق پر نظر ڈالیے اور ان کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، وضعداری کا

انکسار، ادب اور شفقت، دوستی اور محبت، حیا اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا تھا اور ان سے محبت ہونے لگتی تھی۔ اُن کے اخلاق کو دیکھ کر غیر بھی اپنے ہو جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دل آزاری کفر تھی۔ لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔

ایسے جوہرِ قابل کا عین عالمِ شباب میں اُٹھ جانا اس کے خاندان اور اس کے احباب ہی کے لیے ایک المناک حادثہ نہ تھا، بلکہ درحقیقت ایک قومی سانحہ تھا۔ اس کا دل اور دماغ بہت لطیف اور نازک تھا۔ وہ ایک نازک پودا تھا جو سمومِ زمانہ کی تاب نہ لا سکا اور وقت سے پہلے اِس دُنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا۔

(یادگارِ بجنوری ۱۹۵۰ء)